

54

جہلم کے سینے پر

تیج بہادر

بار اوّل ۱۰۰۰

مطبوعہ بروکاز آرٹسٹک پریس سرینگر

قیمت ۲ دو روپے

پیش لفظ

تیج بہادر کشمیر کے اُن نوجوان ادیبوں میں ہے جنہوں نے اُردو افسانہ نویسی کے ذریعے کشمیر کے فطری حُسن و جمال کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بسنے والے چالیس لاکھ انسانوں کے رنج و راحت، عیش و مسرّت، جدوجہد حیات اور جذبات و حسّیات کی سچی تصویریں پیش کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ کشمیر کے بارے میں ہمارے افسانوی ادب میں اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے لیکن بدقسمتی سے پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے علاوہ بہت کم لوگوں نے کشمیر کے شہروں اور دیہاتوں کی صحیح عکاسی پر زور دیا ہے۔ بیرونِ کشمیر کے ادیب برابر اس جنّت ارضی کے رومان خیز افسانے لکھتے رہے ہیں۔ لیکن کرشن چندر، رامانند ساگر اور اوپندر ناتھ اشک تک کے قلم سے بعض اوقات غیر محتاط باتیں نکل گئی ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ماضی کے حسین افسانے اور فطرت کے دلِ فریب مناظر کی چکا چوند میں وہ مادّی حالات اور تاریخی مقتضیات کو وقتی طور سے نظر انداز کر جاتے ہیں اور پھر اہلِ کشمیر کو اس پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان ممتاز اہلِ قلم سے اُن کے سطحی مطالعہ کا شکوہ کریں۔ تیج بہادر، علی محمد لون، اختر محی الدین، امین کامل اور شنکر ناتھ، یہ سبھی نوجوان افسانہ نویس حقیقت کے چہرے سے

رومان کی دلآویز نقابیں ہٹا کے کشمیر کے حقیقی اور فطری حُسن کو ہمارے سامنے لانے کی نیک کوششوں میں مصروف ہیں۔

آج کشمیر سے سارے ہندوستان میں جس گہری دِل چسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مُلک کے ہر گوشے میں کشمیر اور اہلِ کشمیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی جو محبّت بھری خواہش اُبھر رہی ہے اُس کے پیشِ نظر اس قسم کے افسانوی ادب کی تخلیق ایک مستحسن اقدام ہے۔ تیج بہادر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جہلم کے سینے پہ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں کُل آٹھ افسانے ہیں جن میں "نئے کشمیر" میں نئی زندگی کی جھلکیاں دکھائی گئی ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پُرانی دُنیا دم توڑ رہی ہے اور اُسکی جگہ ایک نئی دُنیا جنم لے رہی ہے اور اُس نئی دُنیا کی تعمیر میں کشمیر کی اُبھرتی ہوئی نسل کی تمام تخلیقی قوّتیں صرف ہو رہی ہیں۔

اس مجموعے میں کالج کے نوجوان طالب علم اور طالبات، ہانجی، کاشت کار، مزدور، دُکان دار، سیاست دان، غرض تمام نمایندہ طبقات [illegible] کے مرقّعے آگئے ہیں۔ افسانوں میں مُلکوں اور ریاستوں کی زندگی کے تمام ہمہ گیر پہلو تو نہیں آسکتے لیکن نمایندہ پہلوؤں کی جھلک ضرور آجاتی ہے۔ سب سے زیادہ جو چیز اہمیّت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ زندگی کی عکاسی جامد اور بےجان نہ ہو بلکہ انسان زندہ رہنے کے لئے، بہتر مستقبل کے لئے، تعمیرِ نو کے لئے جو سعی و کوشش کرتا ہے اور جس طرح رُکاوٹ [illegible] کرتا ہے یا رُکاوٹوں کے سامنے سپر انداختہ ہو جاتا ہے اور پھر ہار مان کر [illegible] زندگی ہی کی آغوش میں پناہ لیتا ہے، ان سب کی عکاسی ہے۔

یہ سبھی افسانے سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے کشمیر کی فضا میں لکھے گئے ہیں جب کشمیر میں

عوامی طاقتیں برسرِ اقتدار آچکی تھیں۔ اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن کشمیر میں ایک اور بحرانی دَور اُس وقت آیا جب ۱۹۵۲ء کے آس پاس چند افراد کے طرزِ عمل میں تبدیلی آنا شروع ہوئی اور اقتدار کی خیرہ کُن روشنی میں اُن کے قدم ڈگمگانے لگے۔ چنانچہ عوام سے وہ آہستہ آہستہ دُور ہونے لگتے ہیں۔ "آخ تھو" میں محمدو کا کردار یہ ظاہر کرتا ہے کہ منجھے ہوئے قومی کارکنوں کو بھی کس طرح خوشامدیوں نے بالکل ہی دُودھ کی مکھی بنا دیا تھا۔ وہ عوام کی اس خاموش آواز کو سمجھ نہیں پائے اور نتیجہ ۱۹۵۳ء کی شکل میں ظاہر ہوا۔

دو اور افسانے "سڑے گلے پھل" اور "ڈینگیں" سیاسی موضوعات سے متعلق ہیں۔ "سڑے گلے پھل" میں جنگ کی مخالفت کی گئی ہے اور اس کے ثبوت میں قبائلی حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کا ذکر کر کے اسے کبھی کشمیر کے حالات سے ہی منطبق کر دیا گیا ہے۔ "ڈینگیں" میں کچھ گرمی ضرور آئی ہے لیکن پولیس کے کردار کی نقشہ کشی کرتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر نہیں رکھا گیا ہے کہ جمہوری نظام میں پولیس کی ایک ایک فرد جمہوریت اور جمہوری حقوق کی محافظ ہے۔ اُس پر سے اعتماد زائل کرنے کی کوشش کرنا دراصل غیر جمہوری کوشش ہے۔ اگرچہ افسانہ نویس نے نشانہ سیاسی کارکنوں پر لگایا تھا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ اسکی زد کہیں اور بھی پڑتی ہے۔ ہمارے جو جمہوری ادارے ہیں اُن کے خلاف قلم اُٹھانے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیئے کہ ہماری ذاتی ترجیحات زیادہ اہم ہیں یا جمہوری ادارے۔ مجھے اُمید ہے کہ تیج بہادر بھان اس پہلو پر ضرور دھیان دیں گے اور اس جذباتیت سے بچنے کی کوشش کریں گے جو ہمیں صرف ایک منفیانہ نقطۂ نظر اپنانے پر اُکساتی ہے۔ اس کو سچی ترقی پسندی سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں ہے

مجموعے کا سب سے اہم افسانہ "جہلم کے سینے پر" ہی ہے۔ اپنے نرم و نازک جسم میں آہنی دِل رکھنے والی ہاجرہ کس طرح زندگی کے آلام کا سامنا کرتی ہے اور اپنی زندگی کو تقریباً خطرے میں ڈال کر ایک نئی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ یہ داستان ہمیں گورکی کے افسانہ "پیدائشِ انسان" کی یاد ضرور دِلاتی ہے لیکن یہ اُس کا خاکہ یا چربہ نہیں ہے۔ ہاجرہ خالص کشمیری بیوی ہے جس کے مضبوط ہاتھ ڈانڈ اور چپّو کی مدد سے شب و روز جہلم کا سینہ چیرتے رہتے ہیں اور تعمیرِ نَو کا بوجھ ایک لہر سے دوسری لہر کو منتقل کرتے ہوئے ساحلِ مُراد کی طرف جاتے ہیں۔

اس مجموعے کا ایک افسانہ اپنے اختتامیے کے باعث غالباً ادھورا رہ گیا ہے وہ "دوراہا" ہے۔ شدید برف باری میں اجنبی جگہ میں کبھی کیسے ایک جائے پناہ مِل جاتی ہے اور کیسے یکایک ایک پاکستانی سپاہی بھی ان ہی حالات میں گرفتار اُسی غار میں پناہ لینے کے لئے پہنچتا ہے۔ یہاں تک تو ایک انسانی کہانی ہے لیکن اس کا اختتامیہ کچھ دُرست نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ نہ تو یہ انسانیت ہی کے تقاضوں کا نقطۂ عروج ہے اور نہ صحیح وطنیاتی نظریہ کی ہی ترجمانی کرتا ہے۔ "سنتوش" "ماں" اور "فریب" اچھے نفسیاتی مطالعے ہیں۔

علی جواد زیدی

۲۷ر جون ۱۹۵۸ء

ترتیب

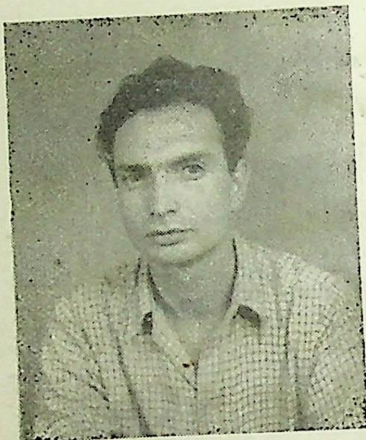
اِنتساب

جناب محترم علی جواد زیدی کے نام

زیدی صاحب نے میرے اوّلین مجموعے کا پیش لفظ لکھا ہے۔ میں نے یہ پیش لفظ ان سے زبردستی لکھوایا ہے اور ان سے یہ چند سطور لکھوانے کے لئے مجھے کیا کیا جتن کرنا پڑے ان کی تفصیل رُوح فرسا بھی ہے اور عبرت انگیز بھی!

اے کاش! پیش لفظ اور دیباچوں کی بدعت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی، اس "رسمِ کہن" کی پیروی میں نئی نسل کو اپنے بزرگوں کا شرمندۂ احسان ہونے کے لئے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ میں اپنے اس اوّلین مجموعے کو زیدی صاحب کی دلنواز قامت ادبی شخصیت سے معنون کرتا ہوں۔ میرا یہ مجموعہ میری خود اعتمادی کی پیداوار ہے اور اس کا دیباچہ میرے احساسِ کمتری کی دلیل!

تیج بہادر



تیج بہادر

سنتوش

سنتوش

سنتوش بال گوندھ رہی تھی۔ بال بہت کھُردرے تھے۔ پر تیل لگانا اُسے منظور نہ تھا۔ تیل کے بغیر بال ... ... پھیلے پھیلے ... ... کالی گھٹاؤں کی طرح چہرے کے گرد بکھرے پڑے رہتے اور اُسکی خوبصورتی میں عجیب تیکھاپن پیدا کر دیتے تھے۔ کنگھی میں بہت سارے بال اٹک اٹک کر ٹوٹ گئے۔ اُس نے اپنی لمبی مخروطی اُنگلیاں کنگھے پر پھیر کر ٹوٹے بالوں کو کنگھے سے الگ کر دیا۔ بالوں کو پوٹلی کی صورت میں مروڑا، اور رسم کے مطابق اُن پر تھوکنے کے بعد گلی میں پھینک دینے کے لئے کھڑکی سے آدھا دھڑ باہر نکال لیا۔

غیر ارادی طور پر اُس کی نگاہیں نُکڑ والے مکان کی شکستہ ڈیوڑھی کی طرف مُڑ گئیں۔ ڈیوڑھی کے کنارے اُسے جانے پہچانے پتلون کے پائینچے دِکھائی دئے اور وہ جھنجلا اُٹھی۔ بہت دِنوں سے وہ اُس کے مکان کو تاکا کرتا تھا۔ پہلے تو کبھی کبھی ہی اُس کی صورت نظر آتی اور سنتوش بھی کوئی توجہ نہ دیتی تھی۔ پر اب تو قریباً دو ہفتوں سے وہ روز آنے لگا تھا۔ کئی موقعوں پر سنتوش کی نگاہیں لڑکے کی نگاہوں سے ٹکرا گئی تھیں اور ہر بار عجیب سی گرمی کی لہر اُس کے گالوں کو چھوکر اُس کے تن وبدن میں سرایت کر جاتی۔ دِل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور وہ دِل کی دھڑکن کو مدھم کرنے کے لئے کھڑکی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی۔

اَن جانے میں اُس نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ ماتھے پر پڑی ہوئی اُلجھی لٹ اُس کے لمبوترے چہرے پر بہت بھلی لگتی ہے۔ کالی پتلون میں اُس کا گورا رنگ پھوٹ پڑتا ہے اور پاؤں میں پہنے موز

کی سفید لکیر اُس کے کالے پتلون اور کالے جوتوں کے درمیان چھپتی ہے۔ شاید کالج میں پڑھتا ہے۔
کیونکہ سنتوش نے اُسے بہت دفعہ کھڑکی کی دراز سے جانچا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں سہتے سہتے
اُکتا جاتا ہوگا بُدھو۔۔۔ ۔۔۔ تبھی وہ ہاتھ میں تھامی کتاب یا کاپی کی بے معنی ورق گردانی
کرتا نظر آتا۔

سنتوش کا کھڑکی سے باہر جھانکنا مشکل ہوگیا تھا۔ جب کبھی وہ کسی کام سے سر باہر نکالتی
تو اُس کی نگاہیں آپ ہی آپ ڈیوڑھی کی اور پھسلتیں۔۔۔ ۔۔۔ ساتھ ساتھ بدن میں سوئیاں
سی چبھنی شروع ہوجاتیں۔ بہت دفعہ اُس کا جی چاہا تھا کہ ماں سے کہہ کے اس بے شرم کی ہڈی
پسلی تڑوا دے۔ پاگل کی طرح کھڑا کھڑا مکان کو ٹکر ٹکر تکا کرتا تھا۔ تکا کرے سنتوش کی بلا
سے۔۔۔ تکتے تکتے اُس کے دیدے ہی تو تھک جائیں گے۔ وہ کمرے کے اندر بھی تو بیٹھ سکتی
ہے۔ پر نہ معلوم اُس کے دل میں کھٹک سی کیوں رہتی ہے؟ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کتاب چھوڑ کر
کھڑکی کی پتلی دراز سے جھانکتی رہتی۔ ڈیوڑھی خالی دکھائی دیتی تو وہ بے کل سی ہوجاتی اور
جو کہیں پتلون کے پائینچوں پر نگاہیں ٹھہر جاتیں تو عجیب اُلجھن ہوتی۔ کچھ دنوں سے تو اس بیماری
نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اُس کی نگاہیں بار بار کتاب کے ورقوں سے پھسل کر سامنے
طاقچے میں رکھی گھڑی کا جائزہ لیتیں کہ کب چار بج جائیں اور وہ دراز میں سے جھانکنا شروع
کر دے۔ سارا وجود مشکل میں پھنس گیا تھا۔ موئے نے چین لوٹ لیا تھا۔ امتحان سر پر تھا۔
یہی حالت رہی تو فیل ہوجانا یقینی تھا۔ وہ کس سے کہے۔۔۔ ۔۔۔ کس کو رازدار بنائے؟ سکول
چھوڑنے کے بعد ایک ہی تو سہیلی رہ گئی تھی — اُس کی چچیری بہن رادھا جو اسی مکان کے
دوسرے حصے میں رہتی تھی۔ پر اُس سے بھی اَن بن ہوگئی تھی۔ رادھا کچھ کچھ بدل گئی تھی۔ شاید
اس لیے کہ وہ کالج جاتی تھی۔ سنتوش کے پتا جی لڑکیوں کا کالج جانا پسند ہی نہیں کرتے۔۔۔ ۔۔۔

کہتے تھے لڑکی بالغ ہو رہی ہے، اب گھر پر ہی بھوشن کی تیاری کرے۔ اُس کا اپنا بس چلتا تو وہ بھی کالج جاتی اور پھر شاید یہ ادھا کہ اتنا اکڑنے کا موقعہ نہ ملتا۔ اب تو بات کئے ہوئے شاید دو مہینے سے بھی زیادہ وقت گذر چکا تھا۔

اور آج بھی وہ ڈیوڑھی کی پرچھائیوں میں چھپا اُسے چیل کی طرح تاک رہا ہے ۔۔۔ کمینہ ۔۔۔ ۔۔۔ جیسے وہ کوئی چوہیا ہے۔ وہ مارے غصے کے تڑپ اُٹھی۔ بال بے نیازی سے گلے میں پھینک کر اُس نے زور سے کھڑکی کے پٹ بند کر دئے۔ پٹ بند کرکے وہ بے قراری سے آئینے کے سامنے بیٹھ گئی! اور آئینے میں اپنے چہرے کا بغور جائزہ لینے سے وہ اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکی۔ آنکھوں میں اُسے کوئی خاص جاذبیت نظر نہیں آئی۔ کاش پپوٹے تھوڑے سے اور موٹے ہوتے اور پلکیں ذرا سی اور لمبی ہوتیں! بس اتنی سی ۔۔۔ ۔۔۔ تو اُس کی آنکھیں بڑی دِل کش ہوتیں! ویسے بھی کوئی بُری نہ تھیں اُس کی آنکھیں ۔۔۔ ۔۔۔ ٹھڈی کے داہنے طرف چھوٹا سا تِل تو بڑا پیارا لگتا تھا۔ گالوں میں سُرخی کی آب ۔۔۔ کالے بالوں کا پھیلا جال ۔۔۔ ۔۔۔ شاید اندھیرے کی وجہ سے زیادہ واضح نہیں ۔۔۔ ۔۔۔ وہ آہستہ سے اُٹھی۔ احتیاط سے کھڑکی کے پٹ تھوڑے سے کھول کر کمرے کا پھر سے جائزہ لیا۔ کمرے میں کافی اُجالا ہو گیا۔ اب تو وُہ بال بنا سکتی تھی، پر وُہ کھڑکی سے ہٹی نہیں ۔۔۔ ۔۔۔ آئینے کے سامنے بال سنوارنے کے بجائے وہ کھڑکی کی دراز سے ہی جھانکنے لگی۔

یکایک وہ چونک پڑی۔ لڑکا ڈیوڑھی سے نکل کر اُس کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قدموں میں ہچکچاہٹ عیاں تھی۔ ہاتھ میں سفید کاغذ کا ٹکڑا تہہ کیا پڑا تھا۔ سنتوش کو محسوس ہوا جیسے لڑکے کو یقین ہے کہ وہ دراز میں سے جھانک رہی ہے گی۔ تبھی کاغذ کے ٹکڑے کو اتنے بے باک انداز میں تھامے تھا۔ جیسے اُسے دکھانا چاہتا ہو۔ شاید چٹھی لکھ رہی ہے۔

...... اُف! بدمعاش کی اِتنی جُرأت ... ...سنتوش کا دِل ڈانوا ڈول ہونے لگا۔ جی میں
آیا کہ کھڑکی کے پٹ پُورے بند کر کے اپنے گھر کی چار دیواری میں محفوظ رہے، پر وُہ ہل نہ سکی۔
سکت ہی نہ تھی اُس کے بدن میں ... ... جیسے کسی نے اُس کی رگوں سے ساری زندگی نچوڑ
لی ہو!

لڑکا بڑھتا آ رہا تھا۔ وہ مکان کے قریب پہنچ گیا۔ سنتوش نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ لڑکے
کا چہرہ ذرا زیادہ لمبوترا ہے۔ چہرے پر ہلکے چیچک کے داغ بھی ہیں اور ناک چہرے کے
توازن سے ذرا زیادہ موٹی ہے۔ لڑکا چلتے چلتے ٹھیک اُس کی کھڑکی کے نیچے رُکا۔ گلی کا پورا
جائزہ لے کر وہ جلدی جلدی چیٹھی کو سامنے والے مکان کے دو پتھروں کے بیچ ٹھونسنے لگا۔ یہ
واضح اشارہ تھا۔ یہ لفنگا بہت بے باک ہوا جا رہا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی۔ رگ رگ
میں عجیب سی درندگی مچلنے لگی۔ بازوؤں میں وحشت بجلی کی سی تیزی سے کوندی۔ جھٹکے سے
اُس نے کھڑکی کے پٹ کھول دئے۔ پٹ ٹکرانے کی آواز نے لڑکے کو بُری طرح بوکھلا دیا۔ وہ
ہڑبڑا کر مُڑا اور سنتوش برس پڑی۔

تُجھے ... لفنگے ... شرم نہیں آتی ... ماں بہن نہیں ہوتی شاید تم لوگوں کی ...
پتھر سے پھوٹ پڑتے ہو ... دیکھ تو مُوا دیدے پھاڑ پھاڑ کے کیسے دیکھ رہا ہے ...
دو چپل مار کے ابھی ... ..." اور لڑکا مزید کچھ سُنے بغیر چیٹھی اُسی درز میں چھوڑ کر ہوا ہو گیا۔

سنتوش نے ٹھنڈی سانس بھری۔ سارا بدن پسینے سے تر ہو گیا تھا۔ وہ تو شکر تھا
پرماتما کا کہ حیا مانع تھی۔ ورنہ نیچے اُتر کے دو چار ہاتھ بھی جما دیتی۔ وہ جلدی سے کھڑکی سے
ہٹ کر کمرے میں واپس آ گئی۔ خوف اُبھر رہا تھا کہ کہیں محلہ والوں نے شور تو نہ سُن لیا۔
بہت دیر تک وہ آئینے کے سامنے بیٹھی اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی

رہی۔ لڑکے کی گھبراہٹ یاد کرکے اُسے ہنسی بھی آرہی تھی اور رحم بھی ... کتنا خوفزدہ ہو گیا تھا بے چارہ ... جیسے میں کھا ہی گئی تھی اُس کو ... خیر ... کچھ شرافت باقی ہوگی خون میں تو توبہ کرے گا آیندہ ... دماغ خراب ہے آج کل کے لونڈوں کا ... ہوں! " اور وہ اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

جوں جوں وہ اس واقعے کو بھولنے کی کوشش کر رہی تھی توں توں پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ دل میں چٹھی دیکھنے کی خواہش بڑی طرح سے مچل رہی تھی۔ سامنے ہی تو پڑی تھی۔ پتھروں کی اندھیری دراڑ میں تارے کی طرح چمک رہی تھی ... منتظر تھی کہ کوئی اُس کا راز جان لے ... کتنی دیر روکے وہ اپنے آپ کو ... کاش وہ اس واقعے کو بھول جائے! ... اس لڑکے کی صورت کو اپنے ذہن سے مٹا سکے ... آئینے میں اپنی پرچھائیوں میں مدغم کر سکے ... کچھ نہ کر سکے تو کم از کم سامنے پڑی کتاب پر رینگتے کالے کیڑوں میں ہی گم کر سکے ... پر بے فایدہ! چٹھی دیکھنے کی خواہش نے آخر اُسے اُٹھنے پر مجبور کر ہی دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کاغذ کے اس بے جان ٹکڑے کو دیکھے بغیر اُسے کبھی چین میسّر نہ ہوگا۔ کشمکش نے اُسے نڈھال کر دیا۔

اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ وہ چپکے سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے وہ دفعتاً رُک گئی۔ سیڑھیوں کے اندھیرے میں ہلکا سایہ ہل رہا تھا۔ وہ بدحواس ہو گئی۔ "کون ہے؟" وہ چلّا پڑی۔ اور سایہ سیڑھیوں کی چرمراہٹ میں غائب ہو گیا۔ شاید رادھا تھی! اُس کا ڈر دُور ہو گیا۔ ناحق وہ پہلے بول پڑی۔ رادھا سمجھے گی پہل اُسی نے کی ... پھر تو اُس کا دماغ اور خراب ہو جائے گا ... ... ہوں۔"

لیکن اس ایک لمحے میں اُس کے پاؤں ہچکچاہٹ نے گھیرے۔ کوئی دیکھ لے تو کون جانے

کیسے بڑے مطلب نکالے گا۔ کتنے غلط معنی ڈھونڈے گا۔ اُسے جانا نہ چاہیئے۔۔۔۔ چٹھی نہ دیکھی تو کیا بگڑتا ہے۔۔۔ ۔۔۔ لیکن۔۔۔ گھر۔۔۔ ہاں اپنا گھر ہے اُس کا۔۔۔ ۔۔۔ اپنا آنگن ہے۔۔۔ ۔۔۔ وہ اپنے گھر میں گھوم سکتی ہے۔۔۔ ۔۔۔ پھر سکتی ہے۔۔۔ ۔۔۔ پر۔۔۔ ۔۔۔ وہ چٹھی۔۔۔ اوہ۔۔۔ ۔۔۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی اور ہچکچاہٹ سے لبریز قدم آگے بڑھتے ہی گئے۔

گلی ملگجے اندھیرے میں ڈوبی سنسان پڑی تھی۔ پھر بھی اُس نے ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا۔ اپنے آپ کو اکیلا پا کر اُس نے جلدی سے پتھروں کی دراز میں سے کاغذ نکالا اور بغیر آگے پیچھے دیکھے اندھا دھند واپس بھاگ آئی۔ سارا بدن تھر تھرا رہا تھا۔

بند کمرے کے بیچ ہانپتے ہانپتے اُس نے چٹھی کھولنی شروع کی۔ اُنگلیاں بڑے زور سے کانپ رہی تھیں۔ نہ معلوم کیا کیا گندی باتیں لکھی ہوں گی اُس لچے نے۔۔۔ ۔۔۔ اس کاغذ کو ہاتھ بھی نہ لگانا چاہیئے۔۔۔ ۔۔۔ پھاڑ کر جلا دینا چاہیئے۔۔۔ ۔۔۔ پر دل کی دھڑکن کا کیا علاج۔۔۔ کیسے سمجھائے اپنے آپ کو۔۔۔ ۔۔۔ چٹھی کھولنے کے لئے وہ بُری طرح سے کلبلا رہی تھی۔ گھبرا گھبرا کے اُس نے چٹھی کھول ہی لی۔ خوبصورت ہندی میں لکھا تھا ــ "جی اور جان سے پیاری رادھا"۔۔۔ رادھا!۔۔ ۔۔۔ دفعتاً وہ رک گئی۔ اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔۔۔ ۔۔۔ گالوں سے چنگاریوں کی بوچھاڑ ہوئی۔۔۔ ۔۔۔ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ چٹھی۔۔۔ ۔۔۔ یہ چٹھی۔۔۔ ۔۔۔ اور وہ خود۔۔۔ وہ۔۔۔ ۔۔۔ وہ بے بس سی۔۔۔ ۔۔۔ بے کس سی کھڑی کھڑی چٹھی کو تک رہی تھی ــ سارے وجود میں نفرت اور غصّے کے کھوڑ طوفان اُبھر اُبھر کر اُس کو جھنجوڑنے لگے۔۔۔ ۔۔۔ جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُس پر چھانے لگے۔۔۔ ۔۔۔ جی چاہا۔۔۔ جی چاہا۔۔۔ اور وہ کھڑے کھڑے ہی کمرے کے وسط میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

فریب

فریب

دیوار پر ٹنگی کھال یوں تو کوٹھڑی کی دھندلی روشنی میں سفید دھبہ سی لگ رہی تھی مگر جب کبھی چولہے میں جلتی لکڑیاں بھڑک اُٹھتیں، تو سفید دھبہ بھی بھڑک کر بچھڑے کی صورت اختیار کرنے لگتا اور بچّے کے سرہانے بیٹھے بیٹھے خورشی کے دُکھی دِل میں ایک اور ڈراؤنا خوف پیدا کر دیتا۔ بچّے پر جھکے جھکے وُہ دیر سے اس کھال کو تک رہی تھی۔ جیسے کہ وہ آنکھوں میں اُبھرتے آنسوؤں کو بھی بھول گئی۔ دھندیالے کمرے میں پھیلتے دھوئیں کی کڑواہٹ کو بھی بھول گئی۔ اور چولہے کے پاس سر جھکائے رحمان کے جھکے بدن کو بھی بھول گئی۔ جو شاید گُم سُم اپنی بے بسی... بے کسی کو شعلوں کی بھڑکتی بجھتی لہروں میں گُم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ چولہے پر مٹی کی ہانڈی چڑھی تھی۔ ہانڈی میں پانی اُبل رہا تھا۔ بھاپ کے مرغولے پانی پر سے اُٹھ اُٹھ کے کالے دھوئیں میں مدغم ہو رہے تھے اور کالا دھواں اس کوٹھڑی کی بڑھتی ویرانی سے بے نیاز چھت کی کڑیوں میں ناچتا... گھومتا... اٹکھیلیاں کرتا ہوا پھوس کی چھت میں گھسا چلا جا رہا تھا۔ پھوس کی چھت سے کہیں کہیں پانی کے قطرے رِس رِس کے نیچے کالے فرش پر سر ٹکرا ٹکرا کر پھیلتے جا رہے تھے۔

کتنی دیر سے رحمان چولہے کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ بے حسی کے کسی ایسے عالم میں تھا کہ ٹانگ میں بڑھتی ہوئی اینٹھن کا درد بھی بھول گیا تھا۔ ہاں صرف سر میں بے انتہا درد ہو رہا تھا۔ جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ [illegible] ...

خورشی کی سوکھی چھاتیاں ... ... ایک درد ہوتا ... ... ایک فکر ہوتی ... ... صرف ایک غم ہوتا۔ تو شاید وہ پھٹے لحاف کے کونے میں گھس کر خورشی کے سوکھے جسم میں اپنے آپ کو بھول لینے کی کوشش کرتا، یا بچے کی دھنسی ہوئی چنچل آنکھوں میں گھور گھور کے سہانے سپنے بُننے لگتا۔ پر ننھے بچے کی آنکھیں تو بند ہو رہی تھیں۔ اُس کے سپنوں کے گھوارے تو ٹوٹ رہے تھے۔ اُس کا مستقبل اُس سے چھینا جا رہا تھا۔ بے درد زمانہ اُس کو پامال کر رہا تھا۔ کاش وہ کچھ کر سکے! ... کاش!

... کاش اس دودھیا دھبّے سے دودھ کے کچھ قطرے ٹپک پڑیں ... ... کاش اُس کی سوکھی چھاتیوں میں ... ... خورشی کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ ایک پہلو لیٹے لیٹے وہ بُری طرح تھک گئی تھی۔ بائیں کہنی میں زور کا درد اُبھر رہا تھا۔ پر کہنی ہلانی اُسے منظور نہ تھی۔ بچہ بخار اور بھوک سے تڑپ تڑپ کر سو گیا تھا۔ نیند میں بھی وہ مُردہ بچہ اُس کی سوکھی چھاتیوں کو مشین کی طرح چوستا جا رہا تھا۔ بارش بدستور ہو رہی تھی، بلکہ اور زور سے گر رہی تھی۔ کبھی کبھی بجلی بھی چمک اُٹھتی اور کوٹھڑی میں نحیف سی روشنی پھیل جاتی۔ شاید برف گرنے والی تھی اور اُن کے گھر میں ایک دانہ نہ تھا۔ ہمسایوں سے مانگ مانگ کر رحمان پریشان ہو گیا تھا۔ اب ہمسایوں کی بے رُخی سہی نہیں جاتی تھی۔ پانی کے اُبلنے کی آواز بہت تیز ہو رہی تھی۔ اُس نے ہانڈی چولھے پر سے اُتاری اور تھوڑا پانی مٹی کے پیالے میں ڈال کر خورشی کی طرف بڑھایا۔

"پانی گرم ہو گیا ہے ... " رحمان نے کہا۔ خورشی کے چہرے پر خاموش بہتے آنسوؤں نے لکیر سی بنا رکھی تھیں۔ چہرہ سوکھ کر ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ بال بکھرے پڑے تھے۔ اُس سے اور نہ سہا گیا۔ ... ... کر ... ... بابا ... ... غریب درد کے

سب دُکھ بھول جائے۔

"پانی سے کیا ہوگا ... ؟ خورشی بپھر گئی۔ "دُودھ چاہیئے ... ... اسے دُودھ چاہیئے ... " غیر ارادی طور پر اُس نے بچّے کو زور سے چھاتی سے لگا لیا۔ لیکن ساتھ ہی اُسے اپنی بے وقوفی پر پشیمانی ہوئی۔ خدا کو دینا ہی تھا تو دو دِن بعد ہی بچھڑا کیوں مر جاتا ... گائے کا دُودھ ہی کیوں سُوکھ جاتا ؟ ...

"میں کہتا ہوں ... ... دو چار قطرے ڈال ہی دو اس کے حلق میں ... ..." رحمان اُس کے غصّے کو نظر انداز کر گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ خود بھی بپھر جاتا .... ہاتھ بھی اُٹھاتا ... پر آج ... ... آج وہ خود نادم تھا ... شرمندہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ خورشی بچے کی فکر میں پاگل ہو رہی ہے۔ پر وُہ بھی کیا کرتا؟ کوشش کر کر کے اُس کے سارے جوڑوں میں درد شروع ہو گیا تھا۔ کام ڈھونڈتے ڈھونڈتے ... ... بارشش ... کیچڑ اور ٹھنڈ نے اُس کے پیروں میں زخم بھر دئے تھے۔ یہ لگاتار بارشش ... جیسے دُنیا بھر کا کام بہا لے گئی ہو۔ یہ بارشش ... خورشی کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ بھی دُکھوں کا ہے۔ اُسے بھی بچے کی فکر ہے، غم ہے۔ وہ بھی اپنے بیٹے کو ہنستا کھیلتا دیکھنا چاہتا ہے۔

خورشی نے گرم پانی سے بھرا مٹی کا پیالہ ہاتھ میں لیا اور رحمان سے بغیر کچھ کہے سُنے بچے کے مُنہ میں تر اُنگلی پھیرنے لگی۔ رحمان کو دھچکا سا لگا۔ کیا آج وہ اس بچے کا باپ ہی نہ رہا؟ کیا خورشی کو اُس کے تھکے جسم سے بھی کوئی دِلچسپی نہیں۔ ؟ کیا آج اُس کے اُترے سُوکھے چہرے کو بھی نظر انداز کر دیا خورشی نے ؟ اُس کے دِل میں عجیب سا درد اُٹھا۔ ٹھیک ہے ... اُسے سزا ملنی چاہیئے ... ضرور اپنے گناہوں کی سزا ملنی چاہیئے۔ ... آخر شادی کرنے کا گناہ کیوں کیا؟ بچہ پیدا کرنے کا گناہ کیا۔ جب وہ اُن کو کھلا نہ

سکتا تھا۔ پتھر باندھتا تھا اپنے ناپاک ارمانوں پر ... ... " وہ دھیرے سے واپس مڑنے لگا۔ اُس کے پیر ہچکچائے۔ شاید خورشی اب بھی پاس بُلائے۔ بچہ اُس کی گود میں ڈال کر اُس کے چہرے کی بلائیں لے ... ... نہیں، صرف اپنا ہاتھ ہی اُس کے چہرے پر پھیرے ...

پر خورشی نے اُسے روکا نہیں، صرف ہچکیوں کے درمیان مانگ کی ۔

" میرے بچے کے لئے کچھ لاؤ ... ... مارنا ہی چاہتے ہو تو پھر پٹک کر جلدی کیوں نہیں مار ڈالتے ؟ "

وہ اور زیادہ نہ سہہ سکا۔ کتنی دیر سے وہ اپنے آپ پر قابو کئے بیٹھا تھا، جیسے صدیوں سے اپنے آپ کو روکے بیٹھا ہو۔ اُس کا غصّہ اُبل پڑا۔

" میں کیا کروں ؟ ... کام ڈھونڈا، نہیں ملا ... ... لوگوں کے پاؤں تک پڑا ... سب جگہ جواب ملا۔ بارش میں کام کہاں ؟ ... اب میں کہاں سے لاؤں ... ... میری رگوں میں خون کے بدلے دودھ ہوتا تو ابھی سیروں نچھاور کرتا اپنے بیٹے پر ... "

رحمان کی آواز میں غصّہ تیز نشتر کی طرح خورشی کو چبھ گیا اور وہ بھوکی شیرنی کی طرح گرج پڑی ... ... " مرد کا کام ہے کمانا ... ... پھر شادی کیوں کی ؟ ... بچہ کیوں پیدا کیا ؟ ... ... میں اپنے لاڈلے کو مرنے نہ دوں گی ... ... " وہ داڑھ مار کر رو دی: " کچھ نہیں ملتا تو جاؤ چوری کرو ... ... ڈاکہ ڈالو ... ... اتنا بڑا جسم کس کام آئے گا ؟ ... مگر میرے بچے کے لئے دودھ کے کچھ قطرے تو لاؤ ... ... صرف چند قطرے ... ... صرف چند قطرے ... ... " خورشی زار و قطار رونے لگی۔ بچہ بھی شور و غل سُن کر جاگ پڑا۔ اور بُری طرح سے رونے لگا۔ کمرے میں دُکھ درد کا طوفان سا اُمڈ آیا۔ جس میں بارش کی سرسراہٹ بھی ڈوب گئی اور رحمان یہ سب کچھ نہ سہہ سکا۔ وہ بغیر جواب دئے دروازے

میں گم ہو گیا

رحمان کے چلے جانے پر خورشی بے طرح گھبرا گئی۔ اندھیری کوٹھڑی اور ویران محسوس ہونے لگی۔ بچہ تو رو ٹھا جا ہی رہا تھا، اب رحمان بھی روٹھ کے چلا گیا۔ کیا معلوم اس بارش میں کہاں کہاں مارا پھرے گا۔ دن بھر خاک چھان چھان کے ہلکان ہوا تھا۔ میں بھی کتنی کمینی ہوں کہ سارا قصور اسی بے چارے کے سر تھوپ دیا۔ سچ جانو تو قصور میرا ہی ہے۔ دودھ تو مجھ کو پلانا تھا بچے کو ... ... چھاتیاں تو میری ہی سوکھ گئیں۔ کاش وہ میرا دکھ درد جان سکتا! ... ... کاش وہ سمجھ سکتا کہ میں بچے کے غم میں بہک گئی ہوں! کہیں رحمان کچھ کر نہ بیٹھے۔ کہیں غصے میں ... ... " خورشی بچے کا منہ چھاتیوں میں پھنسانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اور بچہ تھا کہ چھاتیوں کو اپنی ننھی ننھی جلتی مٹھیوں سے پرے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آہٹ ہوئی اور رحمان دروازے سے اندر آیا۔ خورشی چاہتی تھی کہ رحمان کو پاس بلا کر اس سے معافی مانگ لے، پر غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔ "کچھ لے آئے ... "

رحمان کچھ نہ بولا۔ وہ بچھڑے کی کھال دیوار سے اتار کر چولہے کے پاس گیا۔ کچھ بکھرا گھاس پھوس اور مٹی کا ایک لوٹا اٹھا کے وہ خورشی کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ اور خورشی ان جانی سی خوشی میں ناچنے لگی۔ شاید رحمان کھال بیچنے گیا۔ کوئی خریدار مل ہی گیا ہے۔ سوچا تھا۔ کھال کا بچھونا اپنے لاڈلے کے لئے بناؤں گی۔ پر پھر کبھی سہی ... ... آخر بارش تو رک ہی جائے گی ... ... کہیں نہ کہیں رحمان کو کام تو مل ہی جائے گا۔

گائے نے دودھ دیا ... خورشی ... ... دودھ دیا۔" رحمان کی آواز باہر سے آئی۔ اور خورشی کو یقین نہ آیا۔ گائے نے دودھ دیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ گائے کا بچھڑا تو مر گیا۔ بغیر بچھڑے کے اس کے تھنوں میں سے دودھ کیسے نکل آئے گا؟ کہیں رحمان غم اور تکلیف سے پاگل

تو نہیں ہوگیا!

وُہ پھرتی میں بچے کو چھپاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور کوٹھڑی سے باہر آکر تیزی سے بارش اور کیچڑ کی پرواہ کئے بغیر چوپال کی طرف گئی۔

"دُودھ کہاں ہے؟ ..." ہلکے اندھیرے میں کالی گائے گہرا سایہ سا لگ رہی تھی۔ رحمان گائے کے تھنوں سے ہٹا۔ اُس کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ لوٹا اُٹھانے کا انداز عجیب تھا۔ "یہ لوٹا ... دُودھ ہے اس میں ... اس کا بچھڑا مر گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارا لاڈلا بھی ... ..." خورشی نے خالی ہاتھ سے لوٹا لیا۔ واقعی لوٹے میں دُودھ تھا۔ گرم گرم دُودھ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ سوندھی سوندھی خوشبو خورشی کی ناک میں بڑی تیزی سے سرایت کر رہی تھی۔ "کیسے دیا دُودھ اس نے ... ؟ کیسے دیا دُودھ ؟ ... وہ بے وجہ مخواہ ہنس دی —

اور رحمان نہال ہو گیا۔ غم اور غصے کے بادل ہٹ گئے۔

"آؤ ... دکھاؤں ... ..." رحمان نے ایسے کہا جیسے اُسے ساری دُنیا مِل گئی ہو! جیسے وہ بڑی بھاری فتح حاصل کر کے آیا ہو۔ آخر کیوں نہیں ... ؟ اُس نے دُودھ دُہیا گیا اپنے بچے کے لئے ... ... اپنے بچے کو موت کے مُنہ سے بچایا ... ... خورشی کی محبت کو پھر سے جگایا ... اُس نے فاتح کی طرح گائے کے سر کی طرف اشارہ کیا ...

"یہ دیکھو ..."

اور خورشی نے دیکھا۔ وہ سن سی رہ گئی۔ کالی گائے کے سامنے دُودھیا بچھڑے کی کھال پھولی پڑی تھی۔ کھال میں شاید گھاس پھوس بھری تھی رحمان نے ... ... کھال ہلکے اندھیرے میں بالکل مٹھے بچھڑے کی مانند لگ رہی تھی اور ممتا کی ماری بیچاری

گلے ہلکی ہلکی آوازیں نکالتے ہوئے اُسے چاٹتی جا رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو ... "تم کہاں تھے میرے لال اتنے دن سے۔ میں یہاں تمہارا انتظار کرتے کرتے بہت تھک گئی ہوں۔ ...... اب اُٹھتے کیوں نہیں ... ؟ کیوں اپنی ماں سے چمٹتے نہیں ... " گائے کی آنکھوں سے دو لکیریں جاری تھیں۔ آنسو بہہ بہہ کر نیچے گیلی زمین میں جذب ہو رہے تھے۔ خود رحمتی اور زیادہ نہ سہہ سکی۔ اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اُس کا جی چاہا ... جی چاہا ... اور وہ اُس کے ہاتھ سے دودھ کا لوٹا پھسل کر گر گیا اور زمین پر چکنا چور ہوا۔

"کیا ہوا؟ ... دودھ کیوں گرا دیا؟ ..." رحمان چلایا۔

"کمینہ ... خود غرض ... دھوکے باز ..." وہ اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کی زبان رُندھ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بے تحاشا اُبلنے لگے۔ گائے ٹھٹھک کر اُسے اُداس نظروں سے دیکھنے لگی۔ اور وہ بچے کو سینہ سے چمٹائے رحمان کو حیران و پریشان چھوڑ کر اپنی اندھیری کوٹھڑی کی طرف بھاگنے لگی۔

آخ تھوٗ

آخ تھو

معلوم نہیں کیوں، پر محمدو کی آنکھ کھل ہی گئی۔ گلے میں ٹھیک کا گمان ہوا۔ وہ گھاس کے بچھونے پر اٹھ بیٹھا۔ گلے کو کھنکارا۔ تھوک منہ میں الٹنے پلٹنے لگا اور....
پھر... آخ تھو...

منہ پھر بھی سوکھا سوکھا لگ رہا تھا۔ شاید رات کو ستو کھانے کی وجہ سے یا شاید بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے۔ پنڈال بنانے میں تو کافی محنت کرنی پڑی تھی۔ دو ہی تو آدمی تھے۔ وہ اور اسدو... صمدیو اور علی چوکیدار تو صرف گلا ہی پھاڑتے رہے۔ اٹھانے پڑتے نا وہ شہتیر تو مزا آتا سالوں کو!

بازوؤں میں ابھی تھکان کی کسک باقی تھی۔ چاول تو تھے ہی نہیں گھر میں... دو دن پہلے ختم ہو گئے تھے۔ سیلاب سال بھر کی کمائی بہا لے گیا تھا۔ جتنا کچھ باقی بچا تھا وہ پٹواری نے مجوزے میں دھروا لیا۔ بھوکے پیٹ تھکن محسوس نہ ہوتی کیا...؟

یکایک علی چوکیدار کی آواز دور سے آنے لگی اور محمدو کے ذہن میں لال پگڑی تیرنے لگی۔ لال پگڑی کے نیچے میلے تانبے کے رنگ جیسا چہرہ... ...جس پر آدھی سفید اور آدھی کالی داڑھی مونچھیں ایسے بکھری پڑی تھیں جیسے کل میدان میں گھاس پھوس، جسے صاف کرنے میں اس کی کمر جھک گئی تھی۔ گڑھوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں، پچکے گال، جن میں جھریوں کا روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اور لٹکے بھدے ہونٹ۔ آواز قریب آتی گئی۔

"حرام خور ... ... سب کے سب مرگئے ہیں ... ... جیسے معلوم ہی نہیں کہ شیر کشمیر آرہے ہیں ... نہ کوئی ڈیوڑھی بنائی ہے اور نہ ہی پنڈال سجایا ہے ... ... اس برتے پر کہہ رہے ہیں، ہم نیشنل ہیں ... ... اور تمنا ... اُٹھ بھی۔ جوئی کیا پکڑ کے بیٹھی ہے۔ ذرا دُکان سے کپڑے کے ایک دو تھان دینا۔ محمد جو کا حکم ہے۔ او رے محمد و ... محمد و ... ... مرگئے ہو کیا؟ ... ... اوہ میں کیا کروں؟ ... ... شیخ صاحب آتے ہی ہوں گے اور یہ سب سالے ... ... " آواز دُور ہوتی گئی اور محمد و کے ہونٹ ہنتے گئے۔

"منحوس آدمی ... ... یہی جو کیہ ارمہاراجہ کے زمانے میں ہم پر رُعب جماتا تھا۔ افسروں کی چاپلوسی کی خاطر ہماری شکایت کرتا رہتا تھا اور آج یہی پھر ہمیں سکھا رہا ہے کہ نیشنل کیسے بنیں ... ... مجھ کو ... جس کی ماں مہاراجہ کی فوجوں کے ہاتھوں ذبح ہوئی ... جس کا گھر قبائلیوں نے جلا ڈالا۔ سالا ... لال پگڑی کیا سر پہ رکھی ہے جیسے سارا گاؤں دھر لیا۔ کُتا ... جس نے ٹکڑا پھینکا ... اُسی کا ہوگیا ... آخ تھو ... "

پھٹی رزائی کو ہٹاتے وقت اُس کی نگاہ رحیمی پر پڑی۔ وہ چولھے کے پاس ہی سوئی پڑی تھی۔ تکیے کے بدلے سر کے نیچے ایک بازو پڑا تھا۔ ٹانگیں اکڑی ہوئی ... ... تار تار ہوئے لال پھرن میں اُس کا چہرہ بہت پیلا دکھائی دے رہا تھا۔ اور گالوں پر لکیر سی بنی تھی شاید کل رات کے رونے کی وجہ سے ... ... اُسے دفعتاً محسوس ہوا کہ وہ ایک حیوان سے بھی بدتر ہے۔ رحیمی رات بھر سردی میں اکڑتی رہی اور وہ خود مزے میں سویا رہا۔ روتے روتے بُرا حال ہوگیا ہے بیچاری کا۔ آخر وہ بھی کیا کرے! ... پٹواری پورے چالیس روپے مانگ رہا تھا! اور گھر میں کھانے کے لئے اب مٹھی بھر ستو بھی نہ تھے۔ الجھے میں وہ ... ...

اور وہ جھنجھلا اُٹھا۔ ناحق اُس کے پالے پڑی میکے میں ہوتی۔ ماں باپ وہ امیر نہیں۔۔۔
پر دو بھائی کمانے والے۔ اور پھر کچھ ترکہ اپنی زمین۔۔۔ بھوکوں تو نہیں مرتی بیچاری
۔۔۔ ۔۔۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی ہے۔

رزائی ہٹانے سے اُسے جھرجھری سی آئی۔ وہ اُٹھا۔ رزائی آہستہ سے رحیمی پر ڈال کر
چادر اوڑھتے اوڑھتے باہر نکل آیا۔ روشنی کافی ہو چکی تھی۔ سرد ہوا کے لمس سے
اُس کے پٹھے تن سے گئے۔ دروازہ باہر سے بند کر کے وہ ننگے پیر گاؤں سے ملحق میدان کی طرف
چلنے لگا۔ دور سے آوازیں آ رہی تھیں بے ربط اور وہ سوچنے لگا۔

"شیر کشمیر آنے والے ہیں۔ زمینوں کا انتقال کریں گے۔۔۔ زمین داری ختم ہو جائے
گی۔ پر مجھے کیا۔۔۔ مجھے جھنڈیاں بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، پنڈال سجانے کی
کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو پھر بھی ویسے کا ویسا ہی رہا۔۔۔"

کنکر پر پاؤں پڑتے ہی اُس کے خیالات بے ربط ہو گئے۔ جیسے میدان کے وسط سے
آتی ہوئیں آوازیں۔۔۔ ۔۔۔ میدان کے وسط میں پنڈال کے ارد گرد کاغذ کی رنگ برنگی
جھنڈیوں کی قطاریں لگ رہی تھیں۔ پنڈال، جو کل صرف ڈھانچہ تھا، آج خوبصورت کپڑوں
سے ڈھکا تھا۔۔۔ دلہن کی طرح۔۔۔ بالکل ایسے جیسے شادی پر رحیمی ڈھکی ہوئی تھی۔
اُسے محسوس ہوا کہ پنڈال کو ڈھکنے کے لئے۔۔۔ سجانے کے لئے رحیمی سے کپڑے چھینے
گئے ہیں۔ اُسے ننگا کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اور اُس کے دل میں شدت سے خواہش پیدا
ہوئی کہ ان خوبصورت کپڑوں کو۔۔۔ ان رنگا رنگ کپڑوں کو چھین کر وہ رحیمی
کی ہڈیوں کو ڈھانپ سکے۔۔۔ رحیمی کی عریانی کو صمد جو کی بھوکی خطرناک نگاہوں سے

چھپا سکے۔ پر ساتھ ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ یہ کپڑے بھی تو صمد جو کے ہی

ہوں گے ... ... گاؤں میں اور کس کی اتنی حیثیت تھی۔ بوڑھا ... کھوسٹ ... ...
اپنے بڑھاپے کو رنگین کپڑوں میں ملبوس کرنا چاہتا ہے ... آخ تھو ... ...

"اے تھو کو مت ... یہ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے ... اپنی گورنمنٹ بھی ہو گئی اور یہ سالے تمیز نہ سیکھ پائے ... " علی چوکیدار اپنی اہمیت جتانے لگا اور محمد و بھیکی ہنسی منہ پر پھیلاتے ہوئے پاس ہی پڑے شہتیر کو اُٹھانے لگا۔ شہتیر اُٹھاتے اُٹھاتے اُس کی رگیں تن گئیں۔ پٹھے مچھلیوں کی طرح اُبھر آئے اور وہ دل ہی دل میں اپنے بازوؤں اور صمد جو کے بازوؤں کو جانچنے لگا۔ صمد جو کے سوکھے مریل بازو ... ہوں۔ " اُسے محسوس ہوا کہ ناحق صمد جو اُس کے ذہن پر چھا رہا ہے۔ صمد جو نے تو کوئی ایسی بُری حرکت نہیں کی تھی جس سے اُسے تکلیف ہو گئی ہو۔ ویسے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اور پھر دُکان پر سودا لیتے دیتے وقت آنکھیں بند تو نہیں رکھ سکتے۔

دوپہر تک وہ کام کرتا رہا۔ باہر سے جھنڈیوں ... ڈیوڑھیوں کو سُلجھاتا رہا اور اندر سے تشنہ جذبات کو ... ... بھوک نے تو اُسے اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ اُسے کمزوری سی محسوس ہوئی ...

تھوڑی ہی دیر میں شیر کشمیر ہرے رنگ کی موٹر میں تشریف لے آئے۔ گاؤں کے باہر سے پنڈال تک سڑک سی بنائی گئی تھی جس کی حدیں ڈیوڑھیوں اور جھنڈیوں کی قطاروں سے قائم کی گئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف اپنے اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ پنڈال کے نزدیک ہی گاؤں کے مدرسے کے لڑکے دو طرفہ کھڑے تھے۔ بینڈ زور و شور سے "مارچ پاس" بجا رہا تھا اور لڑکے سلیوٹ کے انداز میں ہاتھ ماتھے پر رکھے ہوئے گا رہے تھے، اپنے کشمیر کا گیت ... ...

—— وہ گیت جسے سُن سُن کے سارا گاؤں تھک گیا تھا۔ سکول کی بلڈنگ کانپنے لگتی تھی جس گیت کو لڑکوں نے طوطوں کی طرح رٹ لیا تھا اور اب وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔ ہر ایک لڑکا کوشش کر رہا تھا کہ میری ہی آواز سب سے اونچی ہو تا کہ ماسٹر صاحب متاثر ہوں ——

—— یہ گیت گو سب کے لئے تکلیف دہ بن گیا تھا۔ پر ماسٹر صاحب تو اسے رحمت کا دیا ہوا تحفہ سمجھتے تھے۔ لڑکوں کو گیت گانے کا حکم دے کر وہ کسی دوسرے کمرے میں حقہ نوشی کرنے چلے جاتے ... ... گپیں لڑانے جاتے ... ... لڑکے بھی کچھ کم شریر نہ تھے۔ گاؤں کا گاؤں سر پر اٹھا لیتے تھے۔ گیت ایک کریہہ چیخ سا بن جاتا۔ اور اس کا جذبہ ... ... اس کی مٹھاس وزیر تعلیم کے دفتر میں پناہ ڈھونڈنے جاتی ... ...

موٹر ٹھیک پنڈال کے سامنے رُکی۔ علی چوکیدار نے بڑھ کر موٹر کا دروازہ کھولنا چاہا۔ پر صمد جو نے چوکیدار کو ہٹا کر خود دروازہ کھولا۔ آخر کیوں نہیں ... ... اپنی دُکان ہے صمد جو کی ... ... گاؤں میں وہی ایک تو ٹھیکیدار ہے۔ آفیسروں کے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا وہی انتظام کرتا ہے ... ... گو یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں علی چوکیدار اور پٹواری کی مدد سے وہ گاؤں والوں سے چندہ اکٹھا کرتا تھا۔

شیخ صاحب، لوگوں کے ہجوم میں سے گزر کر پنڈال پر آ کھڑے ہوئے۔ اور سلام کا جواب کبھی ہنس کر ... ... کبھی سر جھکا کر ... ... اور کبھی ہاتھ سے دینے لگے۔ اور ساتھ ساتھ صمد جو کے ساتھ گاؤں کی ترقی و بہبودی کے متعلق باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ پٹواری بھی اپنا بہی کھاتہ لے کر حاضر ہوا تھا۔ وہ پیش کرنے والے کاغذات سلجھا رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ ہر کسی کی کوشش تھی کہ پنڈال کے بیچ میں بیٹھ کر ... [illegible]

جائے ... اور ہو سکے تو شیخ صاحب کی پاک ذات کو بھی چھو سکے۔

پر اِن سب باتوں سے بے نیاز محمد و ڈیوڑھی کے سہارے کھڑا سوچ رہا تھا — "صبح سے کچھ کھایا نہیں ... آنتوں میں درد ہو رہا ہے۔ معلوم نہیں، رحیمی نے بھی کچھ کھایا کہ نہیں ... بے چاری ... کیا کروں؟ ... سب کوئی یہاں ہے ... کِس سے مانگوں؟"

"شیرِ کشمیر زندہ باد" آواز گونجی۔ محمد و کے خون نے بھی جوش مارا۔ بہت برسوں سے اُس کے خون نے بھی اُبلنا سیکھا تھا۔ وہ بھی ہجوم کے ساتھ نعرے لگانے لگا۔ پر کمزوری کے باعث وہ زیادہ دیر تک ساتھ نہ دے سکا۔ دو دِن سے ستو پر گذارہ کرتے کرتے اب اُس میں اتنی سکت باقی نہ رہی تھی اور پھر صبح سے روزہ ... اُس کا سر چکرایا اور لڑکھڑاتے قدم دھیرے دھیرے گھر کی جانب ہوئے۔

دروازہ کھلا پڑا تھا۔ کوٹھڑی میں زندگی کا گمان نہ ہوتا تھا۔ سوائے دو نگاہوں کے ... جو رحیمی لحاف میں چھپی بے معنی طور پر اِدھر اُدھر پھرا رہی تھی۔ محمد و کی آنکھیں غیر ارادی طور پر چولھے کی طرف مڑیں۔ پر ٹھنڈے چولھے سے نگاہیں واپس لوٹ آئیں ... جیسے برف کی سِل سے سورج کی شعاعیں ... ...

محمد و کو دیکھ کر رحیمی سے اور ضبط نہ ہو سکا۔ کل رات سے وہ سینے پر ایک بوجھ لئے بیٹھی تھی۔ اب برداشت کرنا اُس کی طاقت سے باہر تھا۔ اور وہ ہچکیوں میں جھوک اور غم کو جذب کرنے لگی۔ اُسے روتا دیکھ کر محمد و کی مردانگی عود کر آئی۔ پر کیا ہو سکتا تھا؟ وہ خود مجبور تھا۔ جھوٹی تسلی دینے کی غرض سے اُس نے کہنا شروع کیا —

رونے سے کچھ فائدہ نہیں رحیمی ... ابھی عزیز ہ آئے گا تو بیٹا اُس سے کچھ

لے ہی لوں گا۔ کی ... بستہ ... ... یا شاید کچھ چاول ہی لا دے دے ... ... وہ اِنکار نہیں کرے گا۔"

ٹھیس لگ گئی اور پھوڑا پھوٹ پڑا۔ رحیمی ہچکیوں کے درمیان غصے سے کہنے لگی۔
"تم نے ڈپٹی کشمیر سے کیوں نہیں کہا۔ پٹواری کی شکایت کیوں نہیں کی؟ ہمیں بھی زمین ملنی چاہیئے۔ جیسے اوروں کو ملی۔ ہمیں ویسے کا ویسا کیوں رکھا گیا؟ مرزا اشرف کی زمین تو صمد جُو نے بھی لی۔ علی چوکیدار کے بیٹے نے بھی لی۔ گو وہ اُس زمین کی کاشت نہ کرتے تھے .. ... پر ہم اُس زمین کے کاشت کار ہوتے ہوئے بھی خالی رہ گئے۔ کہتا تھا شیخ صاحب سے ... کہتا تھا پٹواری چالیس روپے مانگ رہا ہے۔"

رحیمی کا دِل غصّہ اُبل کر بھی ہلکا نہ ہوا۔ ایک عورت کی مایوسی اُس کی آواز پہ چھا گئی ... "اُس ظلم سے بھی پٹواری کا دِل بھر نہ آیا۔ کھاتے میں لکھا، ان کا سیلاب سے کچھ نقصان نہیں ہوا ہے۔ جھوٹ بول رہے ہیں، مجوزہ ادا نہیں کرتے۔ اور یہ صمد جُو نے اِتنے کوٹھے جو بھر رکھے ہیں۔ چوگنی قیمت پر خرداز بیچ رہا ہے۔ اُس سے مجوزہ کیوں نہیں لیا ... ہائے ... ... نہ ہی زمین ملی نہ کچھ کھانے کو رہا۔"

محمد و کے دِل کو دھکا سا لگا۔ واقعی اُس پر ظلم ہوا ہے۔ جن کے پاس زمین ہے، اُن سے تھوڑی تھوڑی لے کے زمین دار کے لئے ۸۰ کنال کیوں نہ رکھ دئے پٹواری نے، کیوں اُسے ہی روتے رکھا؟ جب کہ اُس کے پاس اپنا ایک ترک بھی نہیں؟ وہ آج ضرور شکایت کرے گا ... ضرور کرے گا۔ پٹواری کی بھی ... ... صمد جُو کی بھی ... ... پیسے والا ہے تو ہوا کرے ... ... شیر کشمیر اُس کی ضرور سُنے گا ... ... ضرور سُنے گا ..."

وہ بڑبڑاتا ہوا باہر نکلا۔ میدان میں پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ شیر کشمیر انتقالات وغیرہ

سلہ دو من تین سیر

سے فارغ ہوئے ہیں اور اب صمد جو کی بیٹھک پر چائے پینے گئے ہیں۔

وہ کچھ مایوس سا ہو گیا۔ پھر بھی وہ بیٹھک کی اور ہو لیا۔ بیٹھک کے سامنے شیخ صاحب کی موٹر کھڑی تھی اور ڈرائیور سٹیرنگ پر ہاتھ رکھے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ ساتھ دکان پر بیٹھے غلی چوکیدار راستہ روکتے ہوئے کہنے لگا ــــ

"ارے دو منٹ آرام سے بیٹھنے نہیں دو گے انہیں ...... پنڈال پر کھڑے کھڑے تھک گئے ہیں اور اب تو اُن کے پاس وقت بھی نہیں ... "

محمد و کی رگوں میں نفرت کی لہر سی دوڑ گئی۔ "ارے وقت کیوں نہیں ہے۔ کیا وہ ہمارے شیرِ کشمیر نہیں ؟ میں بھی دیکھتا ہوں تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے ! "

چوکیدار اُسے روکنے کے لئے آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ بیٹھک کی سیڑھیوں سے آوازیں آنے لگیں۔ شیرِ کشمیر اور صمد جو مسکراتے ہوئے نیچے آ رہے تھے۔ محمد و آگے بڑھا۔ شیخ صاحب باتیں کرتے کرتے موٹر میں بیٹھ گئے۔ آس پاس سے ہجوم اُبھر آیا۔ صمد جو نے موٹر کا دروازہ احتیاط سے بند کیا تو محمد و کھڑکی میں سے گڑگڑانے لگا ــــ

"حضور شیخ صاحب ... ... میری فریاد سُنیئے ... حضور ... "

ڈرائیور کار سٹارٹ کر چکا تھا۔ شیخ صاحب نے اپنی آواز ذرا اونچی کرتے ہوئے محمد و سے کہا۔ "صمد جو تمہارے حلقے کا پریذیڈنٹ ہے۔ اُس سے بات کرو۔ "

کار آگے نکل گئی۔ صرف ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا محمد و کو چہرے پر محسوس ہوا۔ وہ کھویا کھویا کار کو گرد کے بادلوں میں غائب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پر اُس کے ذہن میں بجلیاں سی کوند رہی تھیں

صمد جُو کے گھناؤنے قہقہے نے اُسے چونکا دیا۔ وہ مُڑا ... ... صمد جُو اپنے سفید دُھتے کو نسواری رنگ کے پھرن پر سُلجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "کیوں بے محمدّہ، رحیمیؔ سے کچھ جھگڑا ہو گیا کیا؟ ... جس کی فریاد لے کر آئے تھے ... ہا ... ہاہا ... "

محمدّہ کو جیسے کسی نے تھپیڑ مارا۔

"صمد جو بوڑھا کھوسٹ ... جس کے سوکھے مریل بازو ـــــ اور ... اور محمدّو سے مذاق ... آخ تھو!



ویٚکِپِن

(پرانده)

وینگین

"ارے عزیزی ... اُٹھ بھی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" غنی نے آنتوں میں درد محسوس کرتے ہوئے پکارا۔ کشتی کھیتے کھیتے اُس کی اُنگلیاں برف کے ٹکڑے بن گئی تھیں۔ پہلے پہلے کچھ سردی محسوس ہوئی تھی۔ پر پانی کے لگاتار لمس سے اعصاب کُند ہونے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اُس کی اُنگلیاں بے حِس مشین کی طرح کام کر رہی تھیں۔

آسمان صاف تھا۔ سُورج ابھی اُبھرا نہ تھا۔ زمین رات کے کُہر کی وجہ سے سفید مہین ململ سے ڈھکی دِکھائی دے رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا غنی کے جسم میں جھرجھری سی پیدا کر دیتا اور وہ سردی سے بچنے کے لئے کچھ دیر چپّو آگے رکھ کے پھٹی ہوئی لوئی کو اپنے ارد گرد اچھی طرح کس لیتا اور پھر کھینا شروع کر دیتا۔

وہ کشتی کے ہلکے ہچکولوں سے بے نیاز دریا کو اگلے موڑ میں گُم ہوتے دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم کتنے موڑ اور ہوں گے! کتنی دفعہ اُس کی راہ ان موڑوں میں گُم ہو جائے گی۔ تب کہیں منزل سامنے آئے گی۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اُسے سری نگر پہنچنا ہے۔ رات ہونے سے پہلے پہلے اُسے کچھ مچھلیاں بیچنی چاہئیں۔ اُسے معلوم تھا، ہندوؤں کا گاڑہ تیوہار تھا۔ "گاڑہ بھتہ"[۱] اور مچھلیاں اچھے داموں پر بک جائیں گی۔ تبھی تو وہ اپنی مخصوص جگہ شادی پور گاؤں چھوڑ رہا تھا۔ نہیں تو اور دِنوں کی طرح وہ بھی اب کے رمضان گاڑہ کے ساتھ کاروبار کرتا۔ یہ رمضان گاڑہ بھی کتنا چلتا پُرزہ ہے! بڑا بڑا سر، جس پہ وہ چِک دار کلاہ ایسے رکھتا

---
[۱] کشمیری ہندوؤں کا تیوہار

تھا جیسے کسی بادشاہ نے تاج رکھا ہو۔ پھر بھی کلاہ گنجی ناند پر کروٹیں لیتی رہتی۔ چہرے پر
لٹکے گوشت میں میٹھی مسکراہٹ داغدار دانتوں کو ننگا کر دیتی۔ سُنا ہے روز ایک دو
بوتل شراب کی اُڑا جاتا ہے۔ تبھی دانت اتنے داغدار ہیں۔ شراب پی کر بھی مُلّا کی طرح
داڑھی رکھتا ہے۔ اُس پر حنائی رنگ ... عقل سٹھیا گئی ہے اُس کی۔ اٹھارہ آنے
ترک مچھلیوں کا ہم سے خرید کے شہر میں تین روپے ترک کے حساب سے فروخت کرتا ہے اور
ہم کو کیسے کیسے چکمے دیتا رہتا ہے کہ شہر میں مچھلیاں بڑی مشکل سے فروخت ہوتی ہیں۔
اِس سال گھاٹے میں ہوں۔ اور یہ تانگے میں جو نئی گھوڑی جُتی ہوئی ہے، یہ آسمان سے
ٹپکی ہوگی۔ اگر کماتا نہیں تو خرچتا کیا ہے؟ دوسرا اُوڑھ کے ایسے آن دھکتا ہے جیسے ہم
سب اُسی کے سہارے زندہ ہیں ... پر آج ... آج میں بھی ... ..."
دفعتاً اُسے محسوس ہوا کہ صبح صبح اُسے رمضان گاڑھے سے کوئی دلچسپی نہیں ...
ہندوؤں کے تیوہار "گاڑہ بھتہ" سے کوئی دلچسپی نہیں ... کوئی سروکار نہیں ...
اس وقت اُسے تو کچھ چاہیے پیٹ بھرنے کے لئے۔ آنتوں میں درد کی ایک اور لہر اُٹھی۔
جس کی تیزی اُس کے چہرے پر عیاں ہوگئی۔ تکلیف اور غصّے کے ملے جلے جذبات چہرے
پر بکھیرتے ہوئے وہ سامنے پڑی گٹھڑی کو گھورنے لگا۔
گٹھڑی پھٹے پرانے کپڑوں سے ڈھکی تھی۔ سورج کی ایک کرن گٹھڑی پر کشتی کے
ہچکولوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ گٹھڑی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔
پھٹے پرانے چیتھڑے ہٹ گئے۔ عزیزہ نے میلے رنگ کا پھرن ٹھیک کرتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔
آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ بال پریشان ... غنی کو بہت بھدّی سی معلوم ہوئی۔ سرسری
سی نظر سے اِردگرد کا جائزہ لے کر عزیزہ نے جماہی لی۔ پھٹے چیتھڑے ایک طرف رکھ کر

وہ کشتی کے دوسری طرف پانی پر جھکی۔ کسی کسی کرتے ہوئے اس نے دو چار ہاتھ پانی کے منہ پر مارے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ گریبان سے منہ پونچھتے ہوئے وہ غنی کی طرف دیکھنے لگی —

"منہ صاف ہوگیا۔ اب چولہے کو گرم تو کر ..." غنی کڑوے لہجے میں بول پڑا۔

"ابھی کہہ اٹھی ... کل بھی تو تیار ہوتے ہوتے دیر سے سو گئی تھی ... اتنی جلدی بھی کیا ہے؟" وہ کانگڑی میں کوئلے اکھٹے کرتے بیٹھی۔ غنی نے پھپھولا کر طنزاً کہا۔

"دیکھو تو ابھی آفتاب بھی طلوع نہیں ہوا ..."

"ہوں" کہہ کر عزیزی کانگڑی پھونکنے لگی۔

بیچارگی پھونکتے پھونکتے عزیزی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غصے سے غنی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ برس پڑی — "لکڑیاں گیلی ہیں۔ کتنی دفعہ کہا، سوکھی لکڑیاں لایا کرو .... آنکھیں پھوٹ جاتی ہیں میری ....."

"یہ بھی کون سی مول آئی ہیں ..... یہ تو دریا میں بہہ رہی تھیں۔ میں نے اٹھا کے کشتی میں پھینک دیں — " غنی صفائی پیش کرنے لگا۔ عزیزی نے ٹھنڈا سانس لیا — جیسے غنی کے کہنے سے لکڑیاں سوکھ گئی تھیں۔ مفت ہی تو آگئیں یہ لکڑیاں، پھر جھگڑا کون کرے .....

غنی نے ایک کھلی جگہ کشتی کو گھاٹ سے لگا دیا۔ اور چائے پینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے عزیزی پوچھ بیٹھی — "کل شام کو رمضان کے ساتھ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی؟" اور غنی مسکرا اٹھا۔ شاید عزیزی کل رات سے بے چین تھی۔ بہرحال سیدھا سیدھا سا جواب دینا ضروری تھا۔ عزیزی ہی اس کا شریک حیات جو ٹھہری — "رمضان گاڑہ

کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں ... ... رحمان کے کہنے سے ہی تو ہم خود مچھلیاں بیچنے شہر جا رہے ہیں۔" ہم کو لوٹ رہا تھا رمضان گاڑہ!"

"سچ .... عزیزی کے دل کی خلش رفع نہ ہوئی۔ "تب تو رمضان گاڑہ جل اٹھے گا۔" اور وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ رمضان گاڑہ سے اُسے بڑی نفرت تھی۔ جب بھی کبھی آتا تھا، اُسے بہت بری طرح سے گھورتا رہتا تھا۔ بہت دفعہ اُس کے جی میں آیا تھا کہ اٹھا کے چپو منہ پہ مارے۔ پر ٹھیکیدار تھا وہ اُس لئے ہمت کبھی نہ پڑی تھی۔

"جلتا ہے، تو جلا کرے!" غنی بظاہر یوں ہی بول پڑا۔ پر دل میں بہت خوش ہوا کہ عزیزی نے اُس کی بات مان لی۔ عورتیں ڈرپوک ہوتی ہیں۔ کہیں گھبرا اٹھتی تو منانا مشکل تھا۔

"مچھلیاں تو بک جائیں گی نا؟" عزیزی نے سماوار سے چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ... "غنی نے جواب دیا۔ آج کل پنڈت مچھلیاں خوب خریدتے ہیں۔" گاڑہ کھتہ ہے نا!"

"کتنے روپے میں بک جائیں گی یہ سب؟" عزیزی نے اپنی نگاہیں مچھلیوں کی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا۔ جیسے نگاہوں میں ہی مچھلیوں کو تول رہی ہو۔

"یہ تو بھاؤ سے پتہ چل جائے گا۔ میرے حساب سے تو دس بارہ روپے آ ہی جائیں گے۔" غنی نے پیالی خالی کر دی۔ چائے نے اُس کی ساری تھکائی دور کر دی تھی۔

"اوہ ...." عزیزی مسکرائی۔ "تب تو نیا پھرن آ جائے گا.... ... دیکھ تو سارا پھرن پھٹ گیا ہے میرا۔" وہ ہاتھ سے پھرن کا دامن پھیلاتے ہوئے بولی۔ جس میں کہیں کہیں چھوٹے چھید پڑ گئے تھے۔ "بڑا اچھا کپڑا تھا یہ ... دو سال چلا ہے۔"

"ابھی مچھلیاں بیچنے تو دے ... " اُس کی آواز تیز ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا۔ "عزیزی
کہ پھرن آ گیا تو میرا شلوار بن چکا۔ شلوار تو سب ٹانکوں سے بھرا پڑا ہے اور ذرا سا
چھید ہو گیا ہے پھرن میں تو نیا پھرن مانگ رہی ہے صاحب زادی ... کشتی کے چھت
میں بھی نئی چٹائیاں لگانی ہیں۔ نہیں تو سردیوں میں برف کی قبر بن جائے گی دونوں کی۔"
"یہیں دن بھر بیٹھنا ہے کیا؟ ... " عزیزی سماوار صاف کرتے کرتے تیز آواز میں
بولی۔ آواز تو تیز ہونی ہی تھی۔ جب کبھی اُس کے پھرن کا ذکر چھڑ جاتا تو وہ غصے ہو کر
چپ سادھ لیتا تھا۔ ان دو برسوں میں ایک گرہ کپڑا بھی نہ لا کے دیا۔ وہ تو بھلا ہو اُس
کے ماں باپ کا، جنہوں نے دو تین پھرن اُس کی شادی پر بنوا ڈالے تھے۔ وہی اب تک
چلے آ رہے تھے ... اور اب ... اب کے تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ لے چھوڑے گی۔"

کشتی جھٹکے سے کنارے سے پھسل گئی۔ دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ کہیں
کہیں کہرا سایوں تلے سفید کپڑے کے ٹکڑوں کی طرح بکھرا پڑا تھا۔ ٹھنڈی ہوا دھوپ کے
تضاد سے اور ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ جسم چیر رہے تھے یہ ٹھنڈے جھونکے اور کشتی
ہچکولے کھاتی ہوئی پانی کو چیرتی جا رہی تھی۔

غنی چپ تھا۔ عزیزی چپ تھی۔ پر اُن کی ذہنی کشمکش دونوں کی آنکھوں
میں نمایاں تھی۔ غنی مرد تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہلکے سبز رنگ کے پانی کی روانی میں بھولنے
لگا۔ ہوا کی خنکی میں بھولنے لگا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ میں بھولنے لگا۔ جو آس پاس کے
خالی کھیتوں میں کوئی بچا کھچا دانہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ پر عزیزی ... عورت جو
تھی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایسے بھڑک اٹھتی جیسے بھڑکتی ہی جائے گی ——
غنی بے نیازی سے اُسے چپ کراتا۔ اُسے سمجھاتا۔ پر اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ یہ

کہتے محسوس ہوتے کہ "اگر تم چپ نہ کروگی تو نہ کرو۔ اپنا گلا سوکھ جائے گا۔ اپنی ہی آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔ میں تو از راہِ ہمدردی ڈھارس بندھا رہا ہوں۔" اور عزیزی اس اُتار چڑھاؤ کو سمجھ کے اور زیادہ مچلنے لگی ... رونے لگی۔

آخرکار وہ اُس لہر کی طرح تھک کر چپ ہوگئی جو چٹان کو ہلا نہ سکتی ہو۔ اس لئے وہ کشتی کے کونے میں لیٹے لیٹے سسکنے لگی۔

غنی پھر بھی چپ تھا۔ جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا، تب سے وہ ان باتوں کا عادی تھا۔ بچپن میں وہ اپنی ماں کو رونا دیکھ چکا تھا۔ اپنی بہنوں کو رونا دیکھ چکا تھا۔ خود اتنا رو چکا تھا کہ اب اُس کی حس مفلوج ہوگئی تھی۔ پر کبھی کبھی زندگی کی تڑپ اُسے بھی جھنجھوڑ کے رکھ دیتی اور وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اسی جذبے کے تحت وہ آج خود شہر مچھلیاں بیچنے جا رہا تھا۔ اور اسی جذبے کے تحت اُس نے عزیزی سے مصالحت بھی کی۔

عزیزی بھی مان گئی۔ وہ اگر نہ مان لیتی تو ویسکین سے بھی ہاتھ دھو دیتی۔ غنی پتھر تھا پتھر ... پر ... پھر بھی نہ معلوم وہ کیوں اُس سے اُلجھنا چاہتی تھی۔ خواہ ایسا کرتے ہوئے زخمی ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کشتی ایک دفعہ پھر ٹھہرائی گئی۔ اور وہ بھی صرف آدھ گھنٹے کے لئے۔ کھانا کھانے کے بعد غنی نے چاہا تھا کہ کچھ آرام کرے۔ کشتی بہاؤ کے برخلاف کھینچتے کھینچتے بازو بُری طرح شل ہوگئے تھے۔ پر عزیزی نے اُسے ٹھہرنے نہ دیا۔ نیا ویسکین اُسے مجبور کر رہا تھا کہ کسی طرح جلد سے جلد شہر پہنچ جائے۔ تاکہ وہ بھی نیا ویسکین پہن کر گاؤں میں پڑوس کے سہیلیوں میں سر اُونچا کر سکے۔ اپنی سہیلیوں پر جتا سکے کہ غنی اُس سے بے پروا نہیں۔

بڑھیا رحیمن کے مُنہ پر تو نیا وینکیپن چانٹا مارے گا۔ اُس کا مُنہ بند کرے گا۔ اور اُس کی لڑکی فاطمہ کی چپٹی جیسی ناک کو اور چپٹا کرے گا۔" راندٗ دوسرے کا سہاگ دیکھ کر جل اُٹھتی ہے...... غنی کو ایسے گھورتی ہے جیسے کھا ہی جائے گی!"

"ارے عزیزی... چُونگی وہ رہی۔" غنی نے اُسے چونکا دیا۔" وہاں تھوڑی دیر رُکنے دے گی نا... بازو چُور چُور ہو گئے ہیں۔" غنی نے ہاتھ اُٹھا کے دُور کنارے پر لال اینٹوں سے بنے ہوئے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے خیالی میں چُونگی کا مکان اور اُس کے سامنے سڑک پر تانگے کو بند کی طرف جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ بند سے پانی سفید بادلوں کی طرح گِر رہا تھا۔ اور بند کے اُس پار کشتیاں اُونچی سطح پر تیر رہی تھیں جیسے بادلوں پر تیر رہی ہوں۔ بند کے دونوں کناروں پر مکان...... سبھی قسم کے... چھوٹے بڑے... پُرانے نئے... حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ پیچھے ہاری پربت کی پہاڑی سُرخی کا ڈھیر سی لگ رہی تھی۔ دریا میں ڈونگے اور کشتیاں ہر طرف بِکھری پڑی تھیں اور ذرا پرے صفا کدل کا پُل اور اُس پر چلتے ہوئے لوگوں کے نقطے پھیلا ہوا نیا وینکیپن محسوس ہو رہا تھا۔ جس پر زر کے تار چمک رہے تھے۔

کشتی دھیرے دھیرے گھاٹ سے آ لگی۔ غنی اپنی پھٹی لوئی کو کشتی میں ہی چھوڑ کے ننگے بدن پر پھٹے واسکٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے چپڑاسی کو بُلانے گھاٹ پر چڑھ گیا۔ گھاٹ پر شام تک رُکنا پڑا۔ آخر بہت دوڑ دھوپ کے بعد چپڑاسی نے دو سیر مچھلیاں اپنا نذرانہ لے کر شہر جانے کی اجازت دی۔ دو سیر مچھلیاں... اس ٹھنڈے پانی میں کِتنی محنت کے بعد پکڑی تھیں یہ مچھلیاں... سارا بدن سُن ہو گیا تھا۔ اور دو سیر مچھلیاں جیسے جان توڑ کر پھر پانی میں کُود گئیں۔

رات بسر کرنے کے لئے وہ مچھلی والوں کے مخصوص گھاٹ پر ٹھہر گئے۔ گھاٹ پر پچھلے سال سیڑھیاں بنی تھیں۔ پر اس سال طغیانی نے نصف کے قریب پتھروں کو اپنی جگہ سے گھسیٹ دیا تھا۔ اور پتھر لڑھک کر بے ترتیب بکھرے پڑے تھے۔ گھاٹ پر آدھی درجن کے قریب اور کشتیاں رکی پڑی تھیں۔ ہلکی پھلکی کشتیاں، جن پر چٹائیوں کی چھتیں کالی چھتریوں کی طرح ٹنگی تھیں، پاس کی دو کشتیوں سے دھوئیں کے بادل فضا میں منتشر ہو رہے تھے۔ گھاٹ کے عین اوپر پرانی مسجد کی دیوار پر لگا ایک دھندلا بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ جس کی روشنی سے گھاٹ کا اندھیرا مایوسی سے لبریز محسوس ہوتا۔

کشتی کو گھاٹ کے ساتھ مضبوطی سے باندھ کر غنی پاس کی کشتی میں آگ مانگنے گیا۔ دوسری کشتی کے سرے پر پاؤں رکھتے ہی اس نے اندر جھانکا۔ اسے چولہے کے پاس کچھ سایے ہلتے دکھائی دئے۔ دبی دبی کھسر پھسر ... کبھی کبھی ہلکا قہقہہ .....

اس نے پکارا — "بھائی ذرا تھوڑی سی آگ کانگڑی میں دینا —"

اندر سے رحمان کی جانی پہچانی آواز آئی — "ارے غنی ہو ... اندر آؤ بھئی۔ ... اندر آؤ —"

غنی کشتی کے وسط کی طرف بڑھا۔ چھت سے سر بچانے کے لئے بدن کو دوہرا کرتے ہوئے وہ اندھیرے میں صورتیں پہچاننے لگا۔

رحمان کالے ہنس مکھ چہرے پر گھنی مونچھوں کا بوجھ سہتے ہوئے پیالے ہٹانے میں مشغول تھا۔ غنی حیران ہو گیا کہ رحمان اتنی جلدی شہر کیسے پہنچ گیا! شاید تانگے پر آیا ہوگا۔ اور پھر یہاں تو سب اپنے ہی بیٹھے تھے۔ کرمو ... رحیمو ... رحیمو کا باپ سونہ کاکا ... ہوں ....

ضرور کچھ بات تھی — وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔ بیٹھتے ہوئے اُس نے کانگڑی سونہ کاکا کی بہو زیتی کی طرف بڑھا دی۔ چولھے میں لپکتے شعلوں سے زیتی کا چہرہ کبھی کبھی بھڑک اُٹھتا تھا۔ اور چہرے پر چیچک کے داغ واضح ہوتے۔ ساتھ ہی کالی لوئی میں اُس کی چھ ماہ کی بچی سوئی پڑی تھی۔ بچّہ دیکھ کر اُس کے دل میں عجیب درد بھری سی گدگدی ہونے لگی۔ اور وہ خیال بدلنے کے لئے بول پڑا —

"اس وقت کھانا نہیں پکا ہمارے ہاں . . . صبح ہی پکا کے رکھا ہے۔"

سونہ کاکا اُس کا درد جانتا تھا۔ وہ اُس کی درد بھری نگاہوں کو بھانپ گیا۔ اس لئے وہ بول پڑا —

"غنی تم کیسے آئے ہو یہاں . . . ؟" غنی سونہ کاکا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اندھیرے کے باوجود سونہ کاکا کی کتری سفید داڑھی میں اُسے میٹھی مسکراہٹ اُلجھتی محسوس ہوئی۔ غنی کا باپ، اور سونہ کاکا آپس میں گہرے دوست تھے۔ غنی کی شادی میں بھی سونہ کاکا ہی کا ہاتھ تھا۔ گو سونہ کاکا بوڑھاپے کی منزل میں قدم بڑھا چکا تھا۔ اُس کی گہری کھانسی اُس بات کا ثبوت تھی۔ پر پھر بھی اُس میں جوانی کا دم خم باقی تھا۔ آج کل اُس نے سارا کاروبار اپنے بیٹے رحیمو کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ صرف کشتی میں بیٹھے بیٹھے اُونگھتا رہتا۔ یا اپنے بیٹے رحیمو کی بزدلی پر چیختا رہتا۔ رحیمو حد سے زیادہ ڈرپوک واقع ہوا تھا۔ کاروبار میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا۔ ٹھیکہ دار کے سامنے تو اُس کی گھگھی بندھتی تھی —

"یوں ہی آ گیا . . . . . . بھاؤ وغیرہ کا کیا حال ہے ؟" غنی نے جواب دیا اور سوال بھی کیا —

"تو تم خود بیچو گے مچھلیاں ... ... کیوں ٹھیکہ دار سے اس سال فیصلہ نہ ہو سکا؟"
کریمو نے اپنے لال واسکٹ کی جیب سے سوکھا تمبا کو نکالتے ہوئے پوچھا۔

"تین یا چار آنے سیر خرید رہا ہے ٹھیکہ دار ہم سے مچھلیاں ... ... اس سے ہمارا پیٹ کیا بھر جائے گا۔" غنی نے اپنی نگاہیں رحمان کی طرف پھینک دیں۔ رحمان سب مچھلی والوں میں "لڑاکا" کے نام سے مشہور تھا۔ کسی سے نہ دیتا تھا۔ جس نے اس کا راستہ کاٹ لیا اس کے پیچھے بری طرح سے پڑ جاتا تھا۔ مچھلیاں پکڑ کر خود بیچتا۔ کیا مجال ٹھیکہ دار کچھ کہہ سکے! پہلے پہل ٹھیکہ دار نے اُسے روکنا چاہا تھا۔ جھگڑنے پر نوبت آگئی تھی۔ جس پر ٹھیکہ دار نے تین مہینے کے لئے جیل بھی بھجوا دیا تھا۔ پر جیل سے آکر رحمان کی سب دماغی حدیں مسمار ہو گئی تھیں۔ جس چیز سے سب ڈرا کرتے تھے؛ وہ رحمان کے لئے ڈر رہا تھا۔ جیل ... جیل ... جیل تو چار دیواری ہے ... ... اس سے ڈرنے کی کیا بات ... ... رحمان کبھی دوستوں کو سمجھاتا ... ... ہاں ... ... ایک بات کا اسے بھی اعتراف تھا کہ جیل میں دم گھٹتا سا محسوس ہوتا ہے۔ اونچی دیواروں سے چڑ سی ہو جاتی ہے۔ باہر کی آزادی گو غلامی سے اچھی نہیں ... پر پھر بھی اچھی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر کھٹکا نہیں رہتا۔ بدن پر پابندی نہیں ـــــ جیل جانے سے رحمان میں صرف ایک تبدیلی آئی تھی۔ اور وہ تھی اس کی گھنی کالی مونچھیں ـــ جنہیں اس نے جیل میں ہی اگایا تھا۔ گھنی کالی مونچھوں نے اس کے چہرے پر ڈراؤنی بے خوفی سی پیدا کی تھی۔ اب غنی کی نظریں اپنے اوپر پا کر اس نے کہا ـــ "سونہ کا کا ... ... بازار میں مچھلیوں کا بھاؤ دس آنے فی سیر ہے۔ کبھی کبھی زیادہ بھی ہو جاتا ہے ... ... کیا رحیمو تم کو کچھ بتاتا نہیں؟"

"بھئی میں بھی خود بیچنے کی سوچ رہا تھا۔ پر ہمت نہیں پڑتی ... " کریما حقے کی چلم میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا۔ لیکن سونہ کاکا کے سامنے نظریں اُٹھانے کی جرأت نہ کر سکا۔

"تم لوگ بزدل جو ٹھہرے ... ہوں!" رحمان بھڑک اُٹھا اور منہ پھیر کر چلم بغیر حقے کو گڑگڑانے لگا۔

"بھئی میں کیا کر سکتا ہوں ... ... ٹھیکہ دار کے آدمی ہر جگہ گشت لگا رہے ہیں۔" رحیمو نے کہا۔ وہ اپنے باپ کے سامنے بزدل نہ بننا چاہتا تھا۔ پر سونہ کاکا اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس کا لڑکا بزدل ہے — بے حد ڈرپوک — کبھی کبھی اُسے اپنے خون پر شک ہونے لگتا۔ اُسے رحمان سے بے حد پیار تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا — "بھئی لڑکا ہو تو رحمان جیسا ... شیر ہے شیر ... کاش میرا رحیمو ! اور پھر رحیمو کو ایسی ایسی گالیاں دینے لگتا کہ توبہ ... ... اور اس وقت بھی رحیمو کے الفاظ میں بزدلی کی بُو پا کر وہ خوفناک کُتے کی طرح غرّا اُٹھا — "گدھے کے بچے ہو تم ... ..." اور رحیمو جھینپ کے رہ گیا۔

رحمان نے سوالیہ نظروں سے غنی کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ غنی کو محسوس ہوا کہ حقے کے دھوئیں کو چیرتے ہوئے رحمان کی نگاہیں بڑی طرح سے جائزہ لے رہی ہیں۔ اُس کی رگوں میں دوڑتے خون کی حدت کو بھانپ رہی ہیں۔ اُس کی دِل کی دھڑکنوں کو گن رہی ہیں ... ... وہ اگر ذرا بھی ٹھٹھکا ... ... تو شلوار ... ... چھت کے لئے چٹائیاں ... ... عزیزی کا دوپٹہ ... ... سب کچھ تو جل کر راکھ ہو جائے گا ... ... سب خواب ... ... خواب ہی رہیں گے ... ... اور پھر عزیزی کا رونا دھونا ... .. وہ کیا کر سکتا ہے ؟ اس لئے وہ بول پڑا — "بھئی میں تو کل مچھلیاں خود بیچوں گا —"

"شاباش ... " سونہ کاکا کو جیسے کھوئی ہوئی دولت ملی۔

"ہاں ٹھیک ہے ... ... " رحمان نے حقہ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ " اگر پیٹ بھر کر کھانا چاہتے ہو تو ایک نہ ایک دن ٹھیکہ دار سے ضرور سامنا کرنا پڑے گا۔"

کشتی سے نکلتے ہی اُسے سردی سی محسوس ہوئی۔ گو آسمان صاف تھا، پر کہر کافی چھایا ہوا تھا۔ زمین ننگے پاؤں کے نیچے برف کی سِل سی لگ رہی تھی۔ کہرے میں ستارے راکھ میں دبے انگاروں کی طرح مدھم تھے۔ وہ پتھروں سے پیر بچا کے اپنی کشتی کی طرف جانا ہی چاہتا تھا کہ اندر سے سرگوشی سی ہوئی۔ وہ غیر ارادی طور پر رُک گیا۔ اندر سے آواز آ رہی تھی۔ شاید کریمو کی تھی۔ غنی پہچان نہ سکا۔

"کاکا بیچنے دے اسے خود مچھلیاں ... ... پھر دیکھنا رمضان گاڑہ اُس کا کیا حشر کرتا ہے۔"

"رمضان گاڑہ کی ایسی تیسی ... ... " سونہ کاکا کی آواز غرائی۔ "غنی مرد ہے۔" غنی آواز کی کڑواہٹ کو محسوس کر کے ہنسی نہ روک سکا۔

عزیزی سردی کی وجہ سے کپکپا رہی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی برس پڑی۔ "دو گھڑی کے لئے کہیں جاتے ہو، تو جیسے جڑ پکڑ جاتے ہو۔" غنی نے جواب نہ دیا۔ عزیزی کا غصہ بڑھ گیا۔ اُس نے کریدنا شروع کیا۔

"کیوں ... کیا بات ہے ... کہاں بیٹھے رہے اب تک ؟"

غنی نے رُک رُک کر جواب دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ہو۔ "یہ سونہ کاکا کی کشتی ہے۔ رحمان بھی وہیں بیٹھا ہے۔ کریمو اور محمدو بھی ..."

"تو بات کیا ہوئی ؟" عزیزی کی آواز ذرا نرم ہوئی۔

"میں سوچ رہا ہوں ... ... ٹھیکہ دار سے جھگڑا ٹھیک نہیں ... سُنا ہے اُس

کے آدمی بازاروں میں چکر لگاتے پھر رہے ہیں۔" غنی کے جواب سے عزیزی کو محسوس ہوا۔
... ... جیسے سب کچھ کھو گیا۔ شادی پور سے یہاں تک کا سفر... ... دِن بھر کا رونا
دھونا... ... غنی کا دِلاسا... ... کبھی کبھار ہی تو دیتا تھا غنی دِلاسا۔

دو سیر مچھلیاں... ... اور... ... وینکپن... ... ہاں وینکپن بھی... ...
کتنے ارمان وابستہ تھے اُس کے اِس وینکپن سے! کس کِس ڈھنگ سے نہ پرو دیا تھا یہ
وینکپن دِن بھر اُس نے اپنے اُلجھے ہوئے بالوں میں... ... پر نہیں... ... وہ وینکپن
کو کھو جانے نہیں دے گی... ... نہیں... ... کبھی نہیں۔" عزیزی نے جذبات کی رَو
میں "نہیں" اتنے زور سے کہا کہ غنی بھی چونک پڑا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

"تمہیں مچھلیاں ضرور بیچنی پڑیں گی... ... سمجھے... ..." عزیزی کی آواز میں
استقلال تھا۔ غنی اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اگر ذرا بھی کچھ کہا تو عزیزی رو رو کے ساری
کشتیاں سر پہ اُٹھالے گی۔ بڑی مشکل سے تو دِن کو چُپ کرایا تھا۔ پھر بھی اُسے سوچ
سمجھ کر قدم اُٹھانا چاہیئے۔ اس لئے وہ نرمی سے اُسے سمجھانے لگا۔ "کام خطرناک ہے
... کہیں لینے کے دینے نہ... ..."

عزیزی نے بات پُوری کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ "کیوں لینے کے دینے پڑیں گے؟
خود مچھلیاں پکڑی ہیں، خود بیچیں گے... ..." آواز میں غصہ نمایاں تھا۔

"پر بھئی تم سُن تو لو... ... غنی جھنجھلا اُٹھا۔ عجیب عورت سے پالا پڑا
تھا۔

"مجھے کچھ نہیں سُننا ہے... ... تم تو بس نامرد... ..." عزیزی رُک گئی۔ وہ
خود نہ جانتی تھی کہ یہ لفظ اُس کے مُنہ سے کیسے ٹپک پڑا۔ غنی غصے ہوگا اور شاید...

... وہ سہم کر غنی کی طرف دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اُسے غنی کا جسم بُری طرح اکڑتا
محسوس ہوا۔ شاید غنی کی آنکھیں اُس پہ جمی تھیں۔ عزیزی پہ سکتہ سا طاری ہو گیا۔
وہ ان نظروں کی تاب نہ لا سکی۔ اور اُس نے مُنہ گھٹنوں میں چھپا کے رونا شروع کر دیا۔
غنی سوچ رہا تھا کہ میں نامرد ... اور یہ سونہ کا کا کیا کہہ رہا ہے ... ...
جب میری اپنی بیوی مجھے نامرد کہے ... سونہ کا کا سیٹھیا گیا ہے ... ... ہوں۔"
اُسے اپنے وجود میں عجیب سی تلخی کا احساس ہوا۔ عزیزی کی اُبھرتی ہچکیاں اُس کے
چاروں اور منڈلانے لگیں۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اُس نے کہا۔ "میں کل خود مچھلیاں
بیچوں گا۔" اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

سورج چڑھتے ہی غنی مچھلیاں ٹوکری میں تہ بہ تہ رکھنے لگا۔ عزیزی ہاتھ بٹاتے
ہوئے بولی ـــ "آواز میں ہچکچاہٹ عیاں تھی ـــ "کس بھاؤ بیچو گے؟" غنی نے
ہچکچاہٹ محسوس کی۔ اُسے رحم سا آگیا۔ وہ حلیمی سے بول پڑا ـــ "بھاؤ تو دس آنے
سیر ہے، میں آٹھ آنے ہی بیچ کے آؤں گا۔"

"جھگڑا ہو تو ڈرنا نہیں۔" ترازو اور بٹے رکھتے ہوئے عزیزی بول پڑی۔

"تم فکر نہ کرو ... " اور وہ جھنجلا اُٹھا۔ "یہ عورتیں ... وہ سوچنے لگا ... ...
عجیب ہوتی ہیں۔ کل تو نامرد کہا اور آج ... ہوں ..."

عزیزی اُس کو گھاٹ پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ سیڑھی پہ قدم اُٹھاتے وقت
اُس کی ٹانگوں پر مچھلیاں اُبھر اُبھر کر ڈوب جاتیں ـــ کالی واسکٹ میں اُس کا گورا
بدن ایسے پھوٹ پڑ رہا تھا جیسے رات کی تاریکی کو چیر کر آفتاب طلوع ہو رہا ہو ـــ
بہت مضبوط بدن تھا اُس کے غنی کا۔ ٹوکری میں سے پانی رِس رِس کر غنی کے

واسکٹ پر گر رہا تھا۔ کالی واسکٹ پر پانی کے ننھے ننھے قطرے ایسے چمک رہے تھے، جیسے ونیکپین کے زردار تار ... ونیکپین یاد آتے ہی وہ چلائی — "میری چیز لیتے آنا ...." اور غنی بغیر کوئی جواب دئے مسجد کی بغل والی گلی میں غائب ہو گیا۔

بازار میں کیچڑ کے باوجود کافی چہل پہل تھی۔ کچھ دکانیں ابھی بند ہی تھیں۔ پر مچھلی والے کی مخصوص دکان پہ خریداروں کا کافی جمگھٹا تھا۔ وہ دکان سے ذرا آگے رُک کر سوچنے لگا — "لوگ مچھلیاں خریدنے یہیں آتے ہیں۔ میری آٹھ آنے سیر کی آواز سن کر وہ ضرور دکان چھوڑ کر میرے پاس مچھلیاں خریدیں گے اِسلئے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا — وہ ہی چار آوازوں پر دکان والا آدھمکا۔ خوب جھگڑا ہوا۔ دکان دار بھی مجبور تھا۔ رمضان گاڑہ سے اُس نے آٹھ آنے سیر کے حساب سے مچھلیاں خریدی تھیں۔ عمر بھر وہ رمضان گاڑہ سے ہی مچھلیاں خریدتا آیا تھا۔ گو یہ دوسری بات تھی کہ یہ مچھلیاں غنی ... کریمو ... محمدو اور اُن جیسے ہی غریب ماہی گیر دریا کو چھان چھان کر پکڑا کرتے تھے — وہ رمضان گاڑہ سے آٹھ آنے سیر خرید کے کیسے بغیر نفع بیچتا۔ دکان کا کرایہ تھا۔ بال بچے تھے اور اگر آج مچھلیاں نہ بیچ دیتا تو دوسرے دِن تک پڑے پڑے سڑ جاتیں۔ اِسی لئے جھگڑا ہوا، تو خوب ہوا۔ ایک دوسرے کی دادیوں ..... نانیوں تک کی تعریفیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ زبان کی رنگینی اور لوچ کو سُننے کے لئے راہ گیر بھی رُک گئے۔ فیصلہ غنی کے حق میں ہوا۔ مچھلی خریدنے والے اُس کی طرف داری کر رہے تھے۔ ناچار دکان دار رمضان گاڑہ کے گھر کی طرف دُہائی دینے کے لئے روانہ ہوا۔

غنی ڈیڑھ ترک مچھلی ایک ہی سانس میں بیچ چکا تھا۔ مچھلیاں دھڑا دھڑ بک رہی تھیں۔ خریداروں کا زور ذرا کم ہوا۔ تو وہ پیسے گننے لگا۔ یکایک کوئی گرجا — "مچھلی

والے!"

نظر اُٹھا کے دیکھا تو گھبرا گیا۔ دونوں ہاتھوں میں پیسے سمیٹتے ہوئے وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے تھانیدار خاکی وردی میں ملبوس ایک ہاتھ میں چھوٹا سا خوبصورت ڈنڈا لیے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی لمبی نوکیلی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا کھڑا تھا۔ تھانیدار کے ذرا پیچھے دو سپاہیوں کے بیچ دُکان دار کھڑا طنزیہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ غنی کا دِل چاہا، سر توڑ دے اُس پاجی کا، پر تھانیدار سامنے کھڑا بُری طرح سے گھور رہا تھا۔

"جی حضور... !" غنی کے لب ہلے۔

"لائیسنس کہاں ہے تمہارا... ؟" غرّاتی آواز نے راہ چلتے لوگوں کو بھی کھڑے ہونے پر مجبور کیا۔

"مچھلیاں پکڑنے کی لائیسنس حضور۔" غنی نے پھٹے ہوئے واسکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"شہر میں مچھلیاں بیچنے کی لائیسنس۔" دُکان دار خوش ہو کر چلّا اُٹھا۔

"تم چُپ رہو۔" تھانیدار کی عزّت کو دھکّا سا لگا۔ ڈپٹتے ہوئے اُس نے دُکان دار کا منہ بند کر دیا اور پھر غنی کی طرف پھرتے ہوئے کہا۔ "ہاں... تمہاری شہر کی لائیسنس!"

"حضور... میرے پاس نہیں... حضور!" غنی گڑگڑانے لگا۔

"لے چلو تھانے..." تھانیدار کی آواز برفیلی لہر کی طرح اُچھلی اور غنی بھی سُن سا ہو گیا۔ کسی نے اُس کی کلائی سختی سے پکڑی۔ ہاتھوں میں سے پیسے چھین لئے گئے۔ ٹوکری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اور وہ اَن جانے بازاروں میں سے دھکیلا گیا۔ صرف اُس کے سامنے تھانیدار کا طرّہ ہی لہراتا رہا۔

وہ سڑک کو چھوڑ کر کشادہ گلی میں ہو گئے۔ گلی کے خاتمے پر بڑا سا مکان تھا۔ تھانیدار سپاہیوں کو رُکنے کا اشارہ کر کے ڈیوڑھی میں داخل ہوا۔ غنی مکان کی طرف دیکھنے لگا۔ نئی سڑکیں ... نئے مکان ... نئی زبان ... سپاہی شاید اُردو میں بات کر رہے تھے۔ گو کشمیری تھے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ بارہا مچھلی والے لائسنس نہ ہونے پر پکڑے جاتے تھے اور سزا کے طور پر اُن کو ڈانٹ ڈپٹ کی جاتی تھی۔ لیکن آج تو اُسے تھانے پر لے جایا جا رہا تھا۔ مکان خوبصورت تھا۔ کھڑکیوں میں رنگین شیشے جُڑے تھے۔ غنی رنگین شیشوں میں سے اندر پردے بھی دیکھ سکا۔ مکان بہت لمبا چوڑا تھا — "یہ تھانہ ہے یا محل ؟" ڈیوڑھی پر کھڑے نوکر نے اُسے سوچنے کی مُہلت نہ دی۔ نوکر سپاہیوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔ اور سپاہی اُسے دھکیل کر اندر لے گئے۔ ڈیوڑھی کے بعد ہی داہنے ہاتھ پر کمرہ تھا۔ کمرے میں قالین بچھے تھے۔ چھت سے بہت بڑا بجلی کا لیمپ چاند جیسا لٹک رہا تھا۔ جس کی پیلی روشنی میں کمرے کی رنگین دیواریں نمکین چائے کے رنگ کی طرح لگ رہی تھیں۔ سپاہیوں نے بُوٹ کھول دئے اور غنی بھی غیر ارادی طور پر پاؤں پونچھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیچڑ میں لت پت پاؤں پونچھ کر بھی صاف نہ ہوئے — پر سپاہیوں نے کیچڑ کی پرواہ کئے بغیر اُسے دھکیل کے کمرے کے وسط میں کھڑا کیا۔ شاید سامنے دوسرا دروازہ تھا۔ دروازے پر ایک سفید پردہ پھیلا ہوا تھا۔ جس کے کناروں پر موتیوں کا جھالر لرزاں تھا۔ دیواروں کے ساتھ کچھ کُرسیاں اور صوفے قرینے سے سجے تھے۔ غنی دیوار پر لگی نیم عُریاں تصویروں کو دیکھنے لگا۔ اندر کوئی کہہ رہا تھا —

"ارے تھانیدار صاحب لائے اُس سالے کو ... اچھی بات ... ہاں ... تو آپ کو کیا فکر ہے ؟"

بھاری آواز پہچان کر وہ کپکپا اُٹھا۔ وہ اچھی طرح سے پہچان گیا کہ ٹھیکیدار کا گھر ہے یہ، ورنہ تھانہ اتنا خوبصورت تھوڑے ہی ہوتا ہے۔" کوئی ہلکی آواز آنے لگی— "دیکھئے جناب! میرے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔ میں تو آپ ہی پر آس لگائے بیٹھا ہوں۔ آپ چاہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

بھاری قہقہہ گونجا— "ہا... ہا... ہو... ہو... وہ کل کا چھوکرہ حلقہ پریزیڈنٹ بننا چاہتا ہے... ہو... ہو... آپ فکر نہ کریں۔ میں ایک اِشارے سے اُسے قلّا بازیاں کھِلاؤں گا۔ ... کیوں ٹھانیدار جی؟"

"کیوں نہیں... ... کیوں نہیں؟... ہاں تو اُس کے متعلق... ..." شاید تھانے دار کہہ رہا تھا۔

کرُسی کی چرُچراہٹ ہوئی۔ غنی کی نگاہیں پردے پر مرکوز ہو گئیں۔ جھالر کے موتی گھنگھنائے۔ پردہ ہٹا اور رمضان گاڑہ باہر آیا۔ ٹھانیدار طرّہ کو پردے سے بچاتے ہوئے رمضان گاڑہ کے بعد ہی نمودار ہوا۔ رمضان گاڑہ رفل کے پھرن میں ملبوس تھا۔ سر خالی تھا۔ گنجی ناند چمک رہی تھی۔ غنی کو محسوس ہوا کہ رمضان گاڑہ کچھ موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ ٹھڈی کا گوشت پچھلے سال سے زیادہ لٹکا ہوا محسوس ہوا۔ لال لال آنکھیں... جیسے آنکھیں دُکھ رہی ہوں، غنی پہ خوفناک انداز سے ٹِکی تھیں۔ غیر ارادی طور پر غنی کا ہاتھ سلام کو اُٹھا۔ سلام کی پرواہ کئے بغیر رمضان گاڑہ نے تھانے دار کی طرف مُنہ پھیر کر کہا۔ "ارے... ... یہ تو غنی ہے۔ برسوں سے میرا اور اس کا کاروبار ہے... ... یہ ایسا نہ تھا، تھانے دار صاحب... ... کسی نے بہکایا ہے اِسے... ..." اور پھر رمضان گاڑہ اُس سے مخاطب ہوا— "حرام خور... یہی بدلہ دینا تھا میری شرافت

کا... وہ تو مجھے ترس آرہا ہے تمہاری پرانی خدمت کا... ... ورنہ کھال اُتروا دیتا۔ ... خبردار جو پھر کبھی ایسی حرکت کی۔" یہ کہہ کر وہ پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔ تھانیدار نے نزدیک آکر غنی کو لات مارتے ہوئے کہا۔ "لے جاؤ اس کُتّے کو... سیدھا کشتی میں بٹھا کر روانہ کرو... ایک سیکنڈ بھی ٹھہرنے نہ دینا۔"

وہ پھر اَن جانے راستوں میں سے دھکیلا گیا۔ جھگڑنے والی جگہ کے پاس اُس کی نگاہیں ٹوکری کی طرف مُڑیں۔ جگہ خالی تھی۔ صرف ٹوکری میں سے رِستے ہوئے پانی کا نشان ابھی گیلا تھا۔

گھاٹ پر کھڑی عزیزی نے غنی کو پولیس والوں کے بیچ بغیر ٹوکری کے آتے دیکھا تو رونا شروع کر دیا۔ وہ بغیر جانے بوجھے سرکار کی دُہائی دینے لگی۔ غنی کا خون کھول رہا تھا۔ گھاٹ پر صرف اُس کی کشتی تھی۔ باقی ماہی گیروں کی کشتیاں شہر کے دوسرے اطراف میں گُم ہو گئی تھیں۔ اُس کے دِل سے ہُوک سی اُٹھی۔ کاش کہیں سے صرف رحمان اُس کی مدد کے لئے آپہنچے... اکاش!... "عزیزی کشتی کے سرے پر چڑھتے ہوئے رو اُٹھی، "کیا ہوا... ٹوکری کہاں ہے... پولیس کیوں ساتھ ہے؟... ... دریا کنارے مکانوں کی کھڑکیوں میں سے لوگوں کے سر اُبھر رہے تھے اور غنی اُن کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے چِلّا اُٹھا۔ "یہ سب رمضان گاڑہ کی کارستانی ہے۔ اگر پولیس والے ساتھ نہ ہوتے تو... خیر دیکھا جائے گا۔ "اُس کا ہاتھ چپّو پر بُری طرح سے تن گیا... ...
عزیزی کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ عمر بھر ویسکین کے لئے ترستی رہے گی؟ کیا اُسے بڑھیا رحیمن کے طعنے سُننے ہی ہوں گے؟ اور اُس کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو رواں ہوئے۔ غنی نے کشتی کھیتے کھیتے عزیزی کی طرف دیکھا۔ عزیزی کی آنکھوں سے

آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ غنی کو محسوس ہوا کہ سورج کی شعاعوں میں عزیزی کے چہرے پر ایک کے بدلے دو زردار ڈینکپن لہرا رہے ہیں!

گلے سڑے پھل

ماں

ماں

چولھے میں جلتی لکڑیوں کی رنگین لپٹیں جل جل کر خاک ہوگئی تھیں۔ دہکتے انگارے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اور چولھے پر رکھی مٹی کی ہانڈی میں سے بھاپ نکلنا بند ہوگیا تھا۔ صرف طاق میں رکھا مدھم دیا ابھی بھی جل رہا تھا۔ شاید تیل کے کچھ قطرے ابھی اُس میں سانس لینے کے لئے باقی تھے۔ مدھم روشنی جھونپڑی میں پھیلی ویرانی میں اضافہ کر رہی تھی۔ کچھ بکھرے برتن ... ... کونے میں پڑی ہوئی ادھ جلی لکڑیاں ... ... پھٹے لحاف کے نیچے پڑا رحمان ... ... سب ہی تو تاریکی کے سمندر میں ڈوبے نظر آ رہے تھے اور رحیمن چولھے کے سامنے بیٹھے بیٹھے اُونگھتی ہی رہی۔

بہت دیر سے وہ اُونگھ رہی تھی۔ چولھے کی گرم دیواریں بھی اپنی حدت کھو چکی تھیں۔ نہیں تو اُس کی ٹانگوں میں اینٹھن نہ بڑھتی۔ چولھے کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ خود اُسکی ٹانگوں میں اب اِتنا خون ہی کہاں تھا جو اُن میں کچھ گرمی باقی رہتی۔ ٹانگوں میں اینٹھن بُری طرح سے اُبھر رہی تھی اور پیٹ میں بھوک ... ... کاش یہ بھوک نہ ہوتی ... ... ! یہ پیٹ نہ ہوتا تو شاید وہ مہینوں ایک جگہ پڑے پڑے بیتے زمانے کے اندھیارے میں ماری ماری پھرتی دِل کی تسکین کے لئے کوئی بھولی بھٹکی روشنی کی کِرن ہی ڈھونڈ لیتی ... ... جس سے شاید بوڑھاپے کی اُن کٹھن گھڑیوں میں کچھ تو اُجالا ہوجاتا۔ پر روشنی کی کِرن ہی کہاں تھی اُس کی

زندگی میں ... اگر کچھ تھا تو اندھیرا ... عمیق اندھیرا ... جس میں کہیں کہیں بھوک ... جلن ... زمانے کے ہاتھوں لگائے گئے ناسور ... خاوند کی جھڑکیاں ... بیٹوں کی مارپیٹ ... زیادہ گہرے ... زیادہ کالے ... ڈراؤنے ... مہیب سایوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ لہرا لہرا کر اُسے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ اُسے محسوس ہونے لگا کہ جیسے بیتے زمانے کی پرچھائیاں اُس پہ ایک بار پھر پوری قوت سے یلغار کرنے والی ہیں۔ اُس کی حیات کی مدھم روشنی ٹمٹما رہی ہے۔ موت اُس کے گرد منڈلا رہی ہے ... منڈلاتی جا رہی ہے۔ اور چولہے کے سامنے پڑے پڑے اس کے دل میں موہوم سا ڈر اُبھرنے لگا۔ اُبھر اُبھر کر اُس کی نس نس میں پھیلنے لگا۔ اُس کا جی چاہا۔ چلائے ... زور زور سے چلائے کہ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتی ہے۔ وہ ابھی ان ان جانے اندھیروں میں ڈوبنا نہیں چاہتی۔ کتنے ہی اندھیرے اُوپر کیوں نہ ٹوٹ پڑیں ... کتنے مہیب سایے لہرائیں۔ کتنی ٹھوکریں اور لگیں۔ وہ پھر بھی خوش ہے کہ اُس کے بازوؤں میں کچھ تو سکت ہے ... اُس کے سینے میں دل تو دھڑکتا ہے۔ پیٹ میں بھوک کی کسک تو محسوس ہوتی ہے۔

ڈرتے ڈرتے اُس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تیل کے آخری قطرے دیئے پر نچھاور ہوگئے تھے۔ دیئے کی لو ٹمٹما رہی تھی۔ وہ اُٹھی۔ کمر میں درد بُری طرح سے اُبھرنے لگا جیسے کسی نے کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ دیئے کے پاس پہنچ گئی۔ طاق میں رکھے ہوئے ٹین کے ڈبے سے دیئے میں تیل کے کچھ اور قطرے ٹپکا دئے۔ لو کا ٹمٹمانا تھم گیا اور اُسے تسکین سی مِل گئی۔

واپس چولہے کی اور مُڑتے ہوئے اُس کی نگاہیں غیر ارادی طور پر لحاف میں

لیٹے پڑے رحمان پر پڑیں۔ اور اُس کا زائل ہوتا ہوا ڈر پھر سے اُبھر آیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس گھر پر کوئی بھیانک طوفان ٹوٹ پڑنے والا ہو۔ جو اُس کی اس جھونپڑی کی کِرم خوردہ کڑیوں کے ساتھ ساتھ اُس کی بوڑھی ہڈیوں کو بھی جھنجھوڑ کے رکھ دے گا۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ہوں ۔ ۔ ۔ ہڈیوں کو جھنجھوڑ کے رکھ دیگا۔ زمانے کے حوادث نے باقی ہی کیا رکھا تھا۔ اب اُس کے بدن میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر طوفان کی آمد کا اُسے یقین ہو چلا تھا۔ نہیں تو صمدو صُبح سویرے اچانک اُس کے سامنے یوں نہ آن ٹپکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

صُبح جب وُہ کھانا کھانے لگی تھی تو صمدو اچانک لنگڑاتا لنگڑاتا کھلے دروازے میں سے اندر پھیلی ہوئی دُھوپ کے دائرے میں سے اُبھر آیا تھا۔ اور وہ بڑی طرح بوکھلا گئی تھی۔ چاولوں سے بھرا ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا تھا۔ بہت دِنوں کے بعد تو آیا تھا وہ اُسکی آنکھوں کے سامنے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید مہینوں بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا شاید برسوں بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُسے پُورا یاد کہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بُڑھاپے میں یادداشت بھی تو ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

لمحے بھر کے لئے اُس کے دِل میں ایک ننھّی اُمنگ نے جنم لیا تھا۔ اُس کا جی چاہا تھا، صمدو کو اُٹھ کر گود میں چھپا لے۔ اُسے خوب پیار سے اپنے سوکھے سینے سے چمٹا دے۔ اُس کے انگ انگ پر چھا جائے۔ اپنے پوپلے مُنہ سے اُس کی خوب بلائیں لے۔ کمزور ٹانگوں کے باوجود وہ اُٹھنے کی کوشش کرتی۔ پر وُہ اُٹھ نہ سکی۔ صمدو کے قرب سے جو عجیب سی کسک اُس کی لٹکتی چھاتیوں میں پیدا ہوگئی۔ وہ صمدو کی نفرت سے لبریز نگاہوں کی تاب نہ پا کر جنم لیتے ہی مر گئی۔ صمدو تو اُسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ اُس کی ماں نہ تھی بلکہ جھونپڑی کی کوئی کرم خوردہ کڑی تھی۔ جب ابھی بھی اپنی جگہ پا کر وہ کچھ حیران سا ہو گیا ہو۔ اُس لئے بیٹھے بیٹھے ہی اُس نے بُجھے دِل سے کہا تھا ——

"بیٹا اندر آؤ... آجاؤ بیٹا... کھانا کھالو۔"

"رحمان کہاں ہے؟" صمدو نے اندر آنے سے پہلے جھونپڑی کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ تو شکر تھا خدا کا کہ رحمان موجود نہ تھا۔ پھر بھی طوفان اٹھنے کے آثار اسکی کمزور نگاہوں سے چھپے نہ رہے۔ اس لئے بات پلٹنے کے لئے وہ بول دی تھی

—"گیا ہے کہیں باہر... آؤ تم کھانا تو کھالو..."

"ہاں... ... بھوک تو بہت لگی ہے مجھے۔" صمدو نے اس کا ڈر دور کیا تھا یا شاید یہ اس کا وہم تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال کچھ ڈرتے ڈرتے... ... کچھ خوف زدہ... ... کچھ پیار سے اس نے صمدو کے سامنے مٹی کی تھالی بڑھا دی تھی خالی سوکھے چاول... ... مرچوں کی چٹنی بھی تو نہ تھی آج... ... اتنے دنوں بعد اس کا ڈھوٹھا بیٹا گھر آیا تھا... ... وہ نادم سی ہو گئی تھی۔

"گھر کی حالت کیسی ہے ماں؟" صمدو نے ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا تھا۔ شاید صمدو نے اس کی زیادہ دھنسی آنکھیں اور چہرے پر بڑھتی جھریوں کو تول لیا تھا۔

"دیکھ تو رہے ہو بیٹا... ..." اس نے منہ پھیر کر جواب دیا تھا۔ ساری کسک... ساری بھوک... ... ساری تھکن آنکھوں سے باہر نکلنے کے لئے مچل رہی تھی۔

"آخر ہو کیا رہا ہے ماں... ...؟ چھت پر نئی گھاس بھی نہیں ڈالی گئی ہے ابھی"۔ صمدو کچھ تیزی سے پوچھ بیٹھا تھا۔ لہجے کی چبھن وہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ ٹھیس لگ گئی اور بند ھ ٹوٹ گیا۔ خیالات کے بہاؤ میں وہ بہت دور تک بہتی گئی۔

"رحمان... ... شوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے... ... مجھے روز مارتا ہے... کہتا ہے میں نے تمہیں اب تک کھلایا، اب تم مجھے کھلایا کرو... ... جیسے اب تک میں نے

دُودھ پلا پلا کر اُسے نہ پالا ہو۔ میں بھلا بوڑھی عورت ۔۔۔ ۔۔۔ بھیک مانگنی پڑتی ہے مجھے ۔۔۔ ۔۔۔ اُس حرامی کو گانجے کی لت پڑ گئی ہے ۔۔۔ ۔۔۔ اب بھی گیا ہوگا کہیں چلم پینے ۔۔۔ ۔۔۔" وہ کہتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ آنکھوں سے پانی ہی تو گر رہا تھا۔ اور کچھ مہینوں سے پانی گرنے کی بیماری اسی اُس کی آنکھوں میں ہو گئی تھی۔ حالات سُن کر صمدو کی آنکھوں میں رحم کے بدلے نفرت کی لکیر اُبھر آئی تھی۔ اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا تھا — "تو ماں ۔۔۔ ۔۔۔ میں آؤں پھر جھونپڑی میں ۔۔۔"

"ہاں بیٹا ۔۔۔ ۔۔۔ تم آجاؤ ۔۔۔ ۔۔۔ میں تو اب ایک دن بھی جی نہیں سکتی ۔۔۔ ۔۔۔ تم ضرور آجاؤ ۔۔۔ ۔۔۔"

وہ فوراً چلا اُٹھی تھی۔ اُسے ڈر تھا کہ ذرا بھی ہچکچاہٹ صمدو نے محسوس کی تو شاید وہ کبھی نہ آئے اور اُس کا یہ آخری سہارا بھی چھن جائے ۔۔۔ ۔۔۔ رحمان سے تو وہ بالکل نا اُمید ہو گئی تھی۔ اپنی خود غرضی کے دھارے میں وہ صمدو کی خود غرضی کو بھی نظر انداز کر گئی۔ کیونکہ سردیاں سر پر تھیں اور صمدو کے سر پر چھت نہ تھی۔ اسی لیئے وہ جھونپڑی میں واپس آنے کے لیئے بے تاب تھا۔ صمدو نے جیب میں سے کچھ پیسے نکال کر کہا تھا — "تو ماں ۔۔۔ ۔۔۔ اب بھیک مانگنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ ۔۔۔ شام کے لیئے چاول لا کے رکھنا ۔۔۔ ۔۔۔ میں ضرور آجاؤں گا۔"

اور وہ نہال ہو گئی تھی۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ہاتھ دُعا کے لیئے اُٹھنے لگے تھے جیسے بھیک مانگتے مانگتے اُس کے ہاتھ اُٹھا کرتے تھے۔ عادت جو ہو گئی تھی اُسے ۔۔۔ ۔۔۔ پر دُعا وہ کس کے لیئے کر رہی تھی؟ صمدو تو کب کا چلا گیا تھا، جب پیسے گننے سے میسر ہوتی تھی۔ آج بہت دن کے بعد اُس کے ہاتھ میں مُٹھی بھر پیسے تھے۔

...... اِتنے سارے پیسے ... ... اُس کا سر غرور سے تن گیا تھا۔ آخر اُسی کا لاڈلا تو تھا صمدو... ... کیوں نہ لاکے دیتا وہ اپنی بھو کی ماں کو پیسہ... چاول... گوشت ... ... آج تو وہ گوشت بھی لے آئے گی... ... ضرور لے آئے گی... ... بہت دن ہوگئے تھے گوشت کا مزا چکھے ہوئے... ...

خیالات کی رَو میں بہتے بہتے وہ اچانک رُک گئی۔ شاید رحمان کروٹ بدل رہا تھا۔ اندھیرے میں لحاف میں لپٹا رحمان بڑا بے ہنگم لگ رہا تھا۔ وہ سانس روکے منتظر رہی۔ لیکن رحمان جاگا نہیں اور رحیمن کے سینے سے جیسے بڑا بھاری بوجھ سرک گیا۔ رحمان جاگ جاتا تو کھانے کے لئے مچلتا اور وہ آج صمدو سے پوچھے بغیر نہیں کھلا سکتی تھی۔ اُس کے انکار پر رحمان کو شاید غصہ بھی آجاتا اور وہ معمول کی طرح اُسے مارتا پیٹتا بھی... ... یا زبردستی کھانا چھین لیتا... ... چھین کے کھاجاتا... ...

پھر... ... پھر صمدو کو وہ کھلاتی کیا... ... صبح سے خود بھی تو بھوکی پڑی تھی صمدو کی خاطر... ... یہ جان کر بھی کہ صمدو کے لہجے میں صبح بڑی نفرت جھلک رہی تھی۔ اُس کو خود بڑا تاؤ آیا تھا صبح صمدو کی نفرت کو محسوس کرکے... ... پر وہ کر ہی کیا سکتی تھی؟...

اُس نے تو خود جنم دیا تھا اس نفرت کو... ... شاید صمدو کے جنم لیتے ہی یہ نفرت بھی جنم لے چکی تھی۔ صمدو کے پیدا ہوتے ہی رحمان کو چڑھ سی ہوگئی تھی۔ کیونکہ وہ رحمان سے بے پرواہ صمدو کو دن دن بھر گود میں اُٹھائے پھرا کرتی تھی۔ صمدو مرا پیر سے کر پیدا نہ ہوتا تو شاید وہ اُسے بھی رحمان کی طرح پہروں جھونپڑی کے کونے میں رو تا چھوڑتی۔ مگر اب یہی بات پر گئی... نکمے لوگوں سے اُس کی تواضع کرتی۔

وہ خود بھی تو گھونسے طمانچے کھا کھا کر اتنی بوڑھی ہو گئی تھی۔ پر صمد و کو دیکھ کر اُسے بہت ترس آجاتا۔ بیچارہ گھٹنوں گھٹنوں بھی بغیر سہارے کے نہ چل سکتا تھا۔ چلنے کی کوشش میں جب بار بار گر جاتا تھا تو کتنی اداس نگاہوں سے اُسے تاکا کرتا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو — "ماں ... کیا قصور تھا میرا ... جو ناکارہ پیدا کیا ... اس سے اچھا تھا جنم ہی نہ دیتی مجھے ... "

اور اُس کے سوکھے سینے میں برچھیاں سی گھس جاتیں ... وہ اس ننھے معصوم کو سمجھانے پر کبھی آمادہ نہ ہو سکی کہ بیٹا اس میں تیری ماں کا کوئی قصور نہیں بلکہ قصور ہے تو تیرے باپ کا ... تیرے باپ کی خطرناک کھانسی کا ... وہ بڑے بڑے خون کے لوتھڑے نہ تھوکتا ... وہ کھانستے کھانستے دم نہ ہارتا تو شاید تمہاری حاملہ ماں کو محنت مزدوری کرنے کی نوبت نہ آتی ... وہ کبھی آمادہ نہ ہوئی تھی یہ خوبصورت جھوٹ بولنے پر ... وہ بھلا سچ بھی کیسے بولتی اس ننھی جان سے کہ اگر اُس کا خاوند کھانس کھانس کے دم نہ بھی توڑتا، پھر بھی وہ لُولا پیر لے کر ہی پیدا ہو جاتا، خاوند کے گھونسوں اور لاتوں سے وہ بچ ہی کہاں جاتی ... اسی لئے تو وہ اُس کے مرنے پر خوش ہو گئی تھی کہ موا مر ہی گیا۔ اتنی بے رحمی سے مارا کرتا تھا کہ سارا محلہ چیخ چیخ کر سر پہ اُٹھا لینا پڑتا تھا۔ جسے کہ محلے والوں کو بھی اُس کی چیخوں میں کوئی دل کشی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور جب وہ چیخ چیخ کے تھک جاتی تھی اور تھک کر اپنے خاوند کے کھوکھلے سینے سے لگ جاتی تھی۔ تو اُس وقت واقعی وہ بھول جاتی تھی کہ مار کھا کھا کے اُس کے انگ انگ میں درد کی ٹیسیں اُبھر رہی ہیں۔ ایک ننھی جان اُس کے پیٹ میں ہے اور وہ بہت بھوکی ہے۔ خاوند کی باتیں یاد کر کے اُس کے بوڑھے سینے میں میٹھی کسک سی اُٹھی۔ بجھی بجھی

نگاہیں اشتیاق سے دروازے کی طرف مڑیں۔ یہ دوسرے لمحے ہی واپس لڑکھڑا آئیں۔ جانے والے چلے گئے تھے۔ وہ بھی کچھ دن اور رہے گی ... کچھ دن اور ٹھوکریں کھائے گی۔ اور پھر کوئی تیز سی ٹھوکر کھا کر وہ بھی لڑھک جائے گی ... لیکن آج تو نہیں ... آج تو اُسے نئے سہارے کا انتظار تھا۔ آج تو اُسے صمدو کا انتظار ... ہوں ... صمدو کا انتظار ... مضحکہ خیز ... اُس رات بھی تو اُس نے صمدو کا انتظار کیا تھا ... شاید وہ رات بھی اتنی ہی اندھیری تھی جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ دئیے کے ٹمٹمانے سے وجود بھی ٹمٹمانے لگتا ہے۔ ذہن میں خواہ مخواہ ڈراؤنے خیالات رینگنے لگتے ہیں۔ اور اندھیرا بے کسی ... بے بسی کا مُنہ چڑانے لگتا ہے۔ ایک ایسی ہی اندھیری رات میں اُسے صمدو کا انتظار تھا۔ بظاہر وہ رحمان کے ساتھ ساتھ چاول کھائے جا رہی تھی لیکن حلق سے نوالا نہ نگلا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ باہر بے چارہ صمدو بھائی کے ڈر سے کھڑا کھڑا اکڑ گیا ہو گا۔ آہٹ تو صاف سُنی تھی اُس نے۔ تب اُس کے کان اتنے بہرے تو نہیں تھے۔ آہٹ سُن کر رحمان نے اُسے معنی خیز نگاہوں سے جانچا تھا۔ کتنا طنز تھا ان نگاہوں میں ... جیسے یہ نگاہیں ... نفرت سے بھرپور اُسکی کچلی ہوئی ممتا کا مذاق اُڑا رہی تھیں ... اُس کا جی چاہا تھا کہ کہہ دے رحمان سے ... چیخ چیخ کے رحمان کو سُنا دے کہ صمدو کُتا نہیں ... اُس کا اپنا بیٹا ہے ... اپنے بدن کا ٹکڑا ... جس پیٹ سے تم نے بھی جنم لیا ہے ... اُسے تمہارے جھوٹے دانے نہیں چاہئیں ... پر اُسکی زبان لڑکھڑا گئی تھی ... وہ کہہ نہ سکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صمدو کو یہ جھوٹے ٹکڑے بھی نہ ملیں تو وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا ... بے بس مزدوری وہ کر ہی نہیں سکتا تھا ... سُوکھا

بدن ... ... مڑا پیر ... ... واضح لنگڑاہٹ اور اینٹوں کی ٹوکری ... ... بیچارے نے بارہا کوشش بھی تو کی تھی، پر لوگ مڑا پیر دیکھ کر ہی واپس لوٹا دیتے تھے ... ... وہ چاہتی تو رحمان ہی کو گھر سے نکال دیتی۔

اُس کے خاوند کے اپنے ہاتھوں سے بنی ہوئی تھی یہ جھونپڑی ... ... پر اُس کی اپنی بھوک ... ... جلن ... ... بڑھاپا ... ... کس کس چیز کو روئے وہ ... ... خالی یادوں کے سہارے پیٹ تو نہیں بھرا جا سکتا تھا۔ اس لئے وہ کچھ نہ کر سکی تھی۔ اور رحمان نے کچھ دانے بچانے کے لئے ممدو کو گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ کتنا گڑگڑایا تھا اُس کا ممدو ... ... اور وہ اُف تک نہ کر سکی تھی۔ رحمان کی ایک ہی تیز نظر نے اُسے راکھ کر دیا تھا۔ جاتے وقت ممدو نے کتنی بے بسی سے اُس کی طرف جھانکا تھا۔ وہ اُن نگاہوں کی تاب نہ لا سکی تھی۔ دل میں خواہش بُری طرح سے مچلنے لگی تھی کہ دھاڑیں مار مار کے روئے ... ... خوب روئے ... ... خوب روئے تاکہ کچھ درد آنسو بن بن کر فضا میں تحلیل ہو جائے ... ... پر پیٹ کے درد کا کیا علاج ... ... پر رحمان کو ناراض کر کے وہ اس بے رحم درد پر کیسے قابو پا لیتی جو روز سرِ شام گھن کی طرح اندر ہی اندر اُس کو کھانے لگتا تھا۔ اُف یہ بھوک ... ... !

بھوک کا خیال آتے ہی وہ چونک پڑی۔ آنتوں میں درد بُری طرح سے مچل رہا تھا۔ منہ میں لعاب کے اَن گنت سوتے پھوٹ رہے تھے۔ تاب نہ تھی اب اور زیادہ انتظار کی ... ... شاید رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جی چاہا، ہانڈی میں سے کچھ رُوکھے دانے ہی چکھے۔ اب بھوک سہی نہیں جاتی تھی۔ پر وہ ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رُک گئی۔ دروازہ کھُل رہا تھا اور ممدو لنگڑاتے ہوئے اندر آ رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے گالوں پہ

بہے آنسوؤں کی لکیروں کو مٹا دیا اور زبردستی چہرے پر خوشی کے آثار بکھیر دئے۔

"آؤ بیٹا... ... کھانا کب کا تیار ہے..." وہ صمد و کی نگاہیں لحاف میں لپٹے پڑے رحمان کی طرف مبذول نہ کرانا چاہتی تھی۔ اور صمد و تھا کہ اندھیرے میں جھونپڑی کا بُری طرح سے جائزہ لے رہا تھا۔

"بیٹھو بیٹا... ... میں کھانا پروس دیتی ہوں۔" اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ واقعی گھبرا رہی تھی۔

شاید صمد و بہت بھوکا تھا۔ اس لئے بغیر کچھ کہے سُنے وہ اُس کے سامنے آبیٹھا۔ رحیمن نے کھانا تھالی میں ڈال دیا۔ اچھے گوشت کے ٹکڑے چن چن کر نکال کے چاولوں کے اُوپر جما دئے۔ صمد و نے بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ پر پانی کے کچھ چھینٹے دئے اور کھانا کھانے لگا۔ پر بار بار رحمان کی جانب نظریں پھیر رہا تھا۔ دفعتاً صمد و نے کہا جیسے اُس کے دل کی گہرائیوں کو ناپ رہا ہو—

"تم کھاتی کیوں نہیں اماں... ؟"

کہیں کچھ غلط فہمی پیدا نہ ہو، اس لئے وہ بھی جھوٹے موٹ ہاتھ مارنے لگی۔ بھوک بے انتہا تھی، پر حلق سے نوالا نگلا نہ جاتا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی ہو۔ "اب کیا ہو... ... اب کیا ہو... ... ؟" یہ سوال اُس کے کمزور ذہن میں اُودھم مچانے لگا۔ صمد و کھانا تیزی سے کھائے جا رہا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ جتنی دیر ہو جائے اُتنی اچھی! تاکہ اُسے کچھ وقت تو ملے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے... ... آج پھر اُسکی بوڑھی ہڈیاں جھنجھوڑی جاتی تھیں... ... کہاں تک وہ برداشت کرتی رہے گی... ... آخر کہاں تک... ؟

بے بس سی وہ اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں میں بڑھتے آب کی چمک روکنے سے قاصر رہی۔
"بیٹا ... ... کہاں رہے آج تک۔" بڑی مشکل سے اُس نے پوچھا۔ خاموشی بھیانک ہو رہی تھی۔

"بس ماں ... ... ایسے ہی بوجھا ڈھو لیتا ہوں لاری اڈے پر ... ... دس بارہ آنے دِن کے بِل ہی جاتے ہیں۔" صمدو نے سر اُٹھانے کی زحمت نہ کی اور اُس کے دِل میں اِک ہوک سی اُٹھی۔

"کتنا تھک جاتا ہے میرا لال!" رحیمن کے دِل میں سچ مچ پیار چھلک آیا۔

"تبھی تو گھر سے نِکال دیا تھا ماں۔" صمدو نے کہا۔ اور وہ تِلملا اُٹھی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ ہی نِکلے۔ رُندھے گلے سے اُس نے کہا۔ "بیٹا ... ... میں بوڑھی عورت ... ... کیا کر سکتی تھی ... ... میری تو کوئی سُنتا ہی نہیں ... ... تمہارے ساتھ اُس دِن چل دیتی تو تم مجھے کہاں سنبھالتے پھرتے ... ... "

"اب تو میرے ساتھ رہنے پر تیار ہو ... ... ؟" صمدو کی آواز میں بڑے تیز تیر تھے۔ اُس کے بوڑھے گوشت میں کہاں اِتنی تاب تھی کہ روک لیتی۔ تیر اندر تک گھستے ہی چلے گئے۔

"بس ماں ... ... اور کھانا نہیں کھاؤں گا۔" صمدو نے اُس کے رونے کو بالکل نظر انداز کر دیا جیسے کوئی کُتیا رو رہی تھی۔ اور وہ تڑپ اُٹھی۔ جی چاہا کہہ دے "میں نے تجھے جنم دیا ہے۔ میں نے تمہیں نو مہینے پیٹ میں پالا ہے۔ تو دُکھ بھوگی رہی، تمہیں کھلایا ... ... یہی بدلہ دِیا میرے دُودھ کا ... ... دو پیسے کمائے تو دھونس جمانے لگے ہو ... ... نِکل جاؤ میرے گھر سے ... ... نِکل جاؤ ... ... " یہ اُس

کے حلق سے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ بھوک کی وجہ سے اُس میں سکت ہی کہاں تھی! کہہ بھی دیتی تو اُس میں طاقت ہی نہ تھی سڑکوں پہ مارے مارے پھرنے کی ... ... در در بھیک مانگنے کی ... ...

صمدو ہاتھ دھو کر اُٹھا۔ تو واضح طور پر رحمان کی اور مڑا۔ رحیمن کے دل میں بے تحاشا خیال پیدا ہوا کہ کاش وہ ڈھال بن سکے ان دونوں کے بیچ۔ صمدو کو روکنے کی کوشش کرنے کے لیئے وہ تیزی سے چلا اُٹھی — "کہاں جا رہے ہو صمدو... ...؟" اور رحمان جاگ پڑا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اُسے شاید یقین نہ آ رہا تھا کہ صمدو اُس کی موجودگی میں اس جھونپڑی میں وارد ہو سکتا ہے۔

"تم نے یہاں آنے کی جرأت کیسے کی ہے" دفعتاً رحمان لحاف سمیت اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دہاڑا۔ پر کچھ سوکھے بدن کی کمزوری... ... کچھ لحاف کی اُڑچن... ... وہ جلدی نہ اُٹھ سکا۔ چشم زدن میں صمدو اُس کے سر پر پہنچا اور بے تحاشا لاتوں اور گھونسوں کی بارش برسانے لگا۔ جھونپڑی کی خاموشی میں دُکھ درد اور درندگی کا طوفان سا پھوٹ پڑا۔ رحیمن تاب نہ لا سکی۔ وہ چیخنے لگی۔ اُسے یقین نہ تھا کہ وہ اتنے زور سے چیخ سکتی ہے۔ "نہیں مارو... ... میرے لاڈلے کو... ... نہیں مارو... ... او صمدو کے بچے!"

رحمان فرش پر لڑھک گیا تھا۔ گانجے نے اُسکی ساری طاقت زائل کر دی تھی۔ وہ ہولے ہولے کراہنے لگا۔ صمدو نے اپنی نگاہیں رحیمن کی طرف موڑ لیں۔ ہلکے اندھیرے کے باوجود رحیمن کو صمدو کی آنکھوں سے نفرت کا دریا اُمڈتا محسوس ہوا۔ اتنی تیزی سے جیسے اُس کے سارے وجود کو ڈبونے پر تُلا ہو۔ اُس کا دم توڑنے پر تُلا ہو۔

"تم کھانا کھا لو ماں ... " صمدو کی آواز بھیانک تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ یہ اُس کے بیٹے کی آواز ہو سکتی ہے۔ "میری باتوں میں دخل نہ دو ... " صمدو نے رحمان کے نیچے سے پھٹا لحاف کھینچا اور جھونپڑی کے دوسرے کونے میں لپیٹ کر سو گیا۔

دیئے میں شاید تیل پھر سے ختم ہو گیا تھا۔ لو بُری طرح ٹمٹما رہی تھی اور رحیمن بھڑکتی بُجھتی روشنی سے بے نیاز کبھی کراہتے رحمان کو دیکھ رہی تھی اور کبھی صمدو کی جھوٹی تھالی میں بکھرے چاول کے دانوں کو ... اور پیٹ میں بھوک بڑھتی جا رہی تھی ——

جہلم کے سینے پر!

جہلم کے سینے پر

چار گھنٹے ــــــــ کتنے طویل تھے یہ چار گھنٹے ... ... زندگی کے کٹھن چار

برسوں سے بھی زیادہ طویل اور رزاق ان چار گھنٹوں میں خوف سے کانپتا ہی رہا ــ

تھر تھراتا ہی رہا۔

اُس نے زونی سے کئی دفعہ پوچھا۔ پر زونی ہر بار انکار میں سر ہلاتی رہی۔ اُس کی

چھاتی پہ پتھر پٹکتی رہی۔

زونی کشتی کے پچھلے سرے پر مسکراتی ہی رہی۔ رزاق کو چڑ سی ہونے لگی اِس

مسکراہٹ سے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مسکراہٹ نہیں، دھوکا ہے، فریب ہے۔ افوہ...

ان چار گھنٹوں میں اُس نے کیا کچھ نہ سوچنا چاہا... سمجھنا چاہا... پر کیا..

... اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ صرف خوف کی ... خوشی کی لہروں میں ڈوبتا رہا۔

اُبھرتا رہا۔

زونی شاید غلط سمجھ رہی تھی۔ اُس کو خودغرض تصور کر رہی تھی۔ آخر وہ بھی تو

بے وقت شہر جا رہا تھا۔ پر وہ زونی کو کیسے بتاتا، کیونکر سمجھاتا کہ اُسے ڈر ہے...

خوف ہے ... اُسکی نگاہیں مٹیالے رواں پانی سے اُٹھ کر زونی کی جانب بار بار

مڑتی رہیں۔ بہت سکون ملتا تھا اُس کو جب زونی پیچھے سے کھیلتے ہوئے اُس کی طرف

شرمیلی نگاہوں سے جھانکتی اور نگاہوں میں تھوڑی سی دیا ... ... تھوڑا سا غرور

جھلک اُٹھتا۔ پھر بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ زونی اُس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ مسکراہٹ کی آڑ میں ۔۔۔ ۔۔۔ آنسوؤں کا ۔۔۔ ۔۔۔ آہوں کا دم گھونٹ رہی ہے۔ محسوس ہوتے ہی اُس کا ذہنی انتشار بڑھ سا جاتا تھا اور کندھے سے لگا ڈانڈ اور زور سے کندھے میں چبھنے لگتا۔

سامنے پل صاف نظر آ رہا تھا۔ دیو ہیکل لاش کی طرح پھیلا پل، موت کی پرچھائیاں نیچے بہتے ہوئے پانی کے تیز دھاروں پر ڈال رہا تھا، جیسے رواں زندگی پر بند ھ باندھ رہا ہو۔ پانی بہتا جا رہا تھا اور بہتے پانی کا شور بھی سُنائی پڑتا تھا۔ جھاگ سطح پر سمٹ کر کھا کھا کر چھوٹے چھوٹے بھنوروں میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہی تھی۔ اٹھکیلیاں کر رہی تھی ـــ

پانی کا شور رزاق کے کانوں میں سرگوشی سی کر رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اور کھنچ گیا۔ آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی، جیسے سرگوشی اُسے آنے والے خطروں سے آگاہ کرنے لگی۔ کشتیوں کے تختوں کے ٹوٹنے کی آواز کا پتہ دینے لگی اور وہ جھنجھلا کر کوسنے لگا ـــ

"آگ لگ جائے اِس دریا کو ۔۔۔ ۔۔۔ کبھی اُتار پر ہے تو کبھی چڑھاؤ پر ۔۔۔ ۔۔۔ میں تو ۔۔۔ ۔۔۔" وہ رُک گیا۔ شاید زونی کراہ رہی تھی یا شاید کشتی پانی کے دباؤ سے کراہنے لگی تھی ۔۔۔ ۔۔۔ اُس کے کان دھوکا تو نہیں کھا گئے ۔۔۔ ۔۔۔ وہ اپنی ہراسانی پر قابو پانے کے لئے زونی کو تکنے لگا۔ زونی کھڑی چپو لئے پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زونی بظاہر پانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پر اُسکی آنکھیں کچھ نہ دیکھ پاتی تھیں۔ وقتی درد کی لہر نے اُس کی نگاہوں کو دُھندلا کر دیا۔ وہ بے حس کھڑی ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ اِنتظار سے لگی ٹانگوں کا [illegible] ہونٹ اور ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

اور انگلیوں کی گرفت چپو پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے درد پہ قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ پیٹ پہ جیسے کوئی تول تول کے مُکّے مار رہا تھا۔ سانس گھٹتا سا محسوس ہوا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ہونٹ ڈھیلے پڑ گئے۔ ہلکی چیخ دانتوں میں سے پھسل سی گئی اور وہ گھبرا کر رزاق کو دیکھنے لگی۔ آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو رزاق ڈانڈ پر جھکا ٹیڑھا میڑھا دکھائی دیا اور زونی کے سینے سے جیسے بھاری بوجھ سرک گیا۔

رزاق اگر چیخ سُن پاتا ... تو شاید ڈانڈ پھینک کر اُس کی طرف لپکتا .. ... اور کشتی بے قابو ہو کر کنارے سے ٹکرا جاتی۔ اسی لئے تو زونی تکلیف کے باوجود چپو تھامے رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے زور زور سے دبائے ... ... اتنا دبائے ... ... اتنا دبائے کہ کمر سے چپک جائے ... ... پہ کیسے ... ؟ وہ چپو تو نہیں چھوڑ سکتی تھی ... . پتوار بغیر کشتی کنارے کیسے لگتی ... ؟

زونی کو چپو پکڑے دریا کو گھورتے دیکھ کر رزاق کی ڈھارس ذرا بندھ گئی۔ پھر بھی سینے پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ جیسے ساری کشتی کا وزن اُس کے سینے پر لہرا رہا تھا۔ دُکھ سے بوجھل اُس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ کل دِن اور آج کے دِن میں کتنا فرق تھا۔ کل بھی زونی مُسکرا رہی تھی۔ پر اس مُسکراہٹ میں کتنی اُمید تھی ... ... کتنی خوشی تھی ... ... اور آج ... ... آج وہ سمجھنا نہ چاہتا تھا ... ... سوچنا نہ چاہتا تھا۔ پھر بھی اُس پہ واضح تھا کہ آج زونی کی مُسکراہٹ آنسوؤں میں نہائی ہوئی ہے۔ دبی چیخوں سے لبریز ہے۔ اس لئے وہ دِل ہی دِل میں نادم ہوا کہ کیوں شہر کی طرف روانہ ہوا ... ... کیوں نہ زونی کو آرام کا موقع دیا ... ... پر کل ... کل تو اور بات تھی۔

کل دریا میں پانی زیادہ نہ تھا۔ سفر کا پہلا دن تھا۔ اس لئے کھُردرا لکڑی کا ڈانڈا نرم محسوس ہو رہا تھا اور کندھے پر ڈانڈ کا دباؤ ہلکی تھپکی۔ پانی نیلگوں تھا۔ زوُنی کی نیلی آنکھوں سے کتنا مُشابہ... ... جیسے زوُنی کی نیلی آنکھوں کی پرچھائیں سارے دریا پر چھائی ہوئی تھی۔ اور لہریں نیلگوں پانی پر سُورج کی شعاؤں سے چاندی کی گوٹا کناری بُننے میں مصروف تھیں۔

اور کشتی دریا کی ہلکی تھپکیاں سہتی ہوئی بڑھتی جا رہی تھی۔ لہروں کی چپ چپ کی میٹھی آواز پر کسی نوزائیدہ بچے کے دُودھ چُوسنے کی آواز کا گمان ہوتا تھا۔ وہ بجری سے بھری کشتی اکیلے کھے رہا تھا۔ اور زوُنی پچھلے سرے پر کھڑے کھڑے چپو سے پتوار کا کام لے رہی تھی۔ ہوا کے گرم جھونکے زوُنی کے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ ہلکے سُرخ گالوں سے بال ہٹاتے وقت زوُنی کتنی بھلی لگتی تھی۔ کبھی کبھی وہ لہروں کی لَے سے لَے مِلاتے ہوئے گنگنا بھی اُٹھتی تھی۔ زوُنی کی باتیں... ... حرکتیں ... ... قہقہے شوخ ہوتے جا رہے تھے۔ اور اُسے محسوس ہوا تھا کہ زوُنی کی طبیعت خراب ہونے والی ہے۔ زوُنی کی باتیں... ... حرکتیں اُسے پریشان کرنے لگیں۔ آخر گاؤں کی بوڑھی دایہ کا اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔ اور زوُنی کا پیٹ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے پھیرن کے باوجود اُبھار صاف نمایاں تھا۔ لیکن زوُنی اُسکی فکر سے بے نیاز چپو تھامے خاموش کھیتوں کو تک رہی تھی۔ کھیتوں سے پرے دُور نیلے پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ رزاق کو محسوس ہوا جیسے یہ پہاڑ اُس کے اِردگرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ مہیب دیوزادوں کی طرح خاموشی سے اُس کی بربادی کے منتظر ہیں — خاموشی اُس کے کانوں پر بوجھ بن کر چھانے لگی اور اُس کے دل میں شدّت سے

خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ شہر جلدی پہنچ جائے ... ...

رزاق شہر کسی حالت میں نہ آتا۔ گو ٹھیکیدار کو بجری کی بڑی ضرورت تھی۔ پر اُسے آنا پڑا۔ چاول ختم ہونے لگے تھے۔ پیسہ کوئی پاس تھا نہیں اور دن گذرتے جا رہے تھے۔ ایسے میں اُسے کچھ نہیں سوجھا، سوائے شہر آنے کے۔ اُس نے سوچا کہ شہر پہنچ کر ٹھیکیدار سے پیسے بھی لے لوں گا اور کسی ڈاکٹر سے زونی کا ملاحظہ بھی کراؤں گا۔ شہر میں خیراتی دواخانے بھی تھے اور دو چار روپے خرچ بھی ہو جاتے تو ... ... اور اُس نے زونی سے پوچھا تھا ــــ

"کیا خیال ہے تمہارا ... ... شہر چلیں ؟"

"ہاں ہاں ... ... دیکھو چاول بھی ختم ہو رہے ہیں ... ... وہاں ٹھیکیدار سے کچھ روپے تو ملیں گے۔" زونی نے پیٹ چھپاتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"تمہاری حالت غیر یقینی ہے، پتوار پکڑ سکے گی۔" وہ خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا۔

"میں اچھی بھلی تو ہوں ــــ" زونی نے جواب دیا تھا۔ لیکن اُسکی تسلی نہ ہوئی تھی۔ وہ جانا تو چاہتا تھا، پر ڈر تھا کہ کہیں زونی کو راستے میں تکلیف نہ ہو۔ اس اُمید پر کہ زونی شاید انکار کر دے، وہ کہنے لگا۔ "دو دن لگیں گے شہر پہنچنے میں ... ... اور مزدور بھی نہیں لے سکوں گا کرایے پر ... ... کشتی اکیلے ہی لے جانی پڑے گی۔"

"میں دو دن میں مر نہیں جاؤں گی ــــ" زونی غصے سے بولی۔ وہ چاہتی تھی کہ رزاق کسی طور شہر چلا جائے۔ کیونکہ چاول ختم ہو رہے تھے اور اُمید بر آنے پر برادری

کے دو چار آدمیوں کو بُلانا ضروری تھا۔ اُس کی اپنی دو چار سہیلیاں بھی تو منتظر تھیں۔ اور رزّاق نے بالآخر کشتی کا رُخ شہر کی طرف پھیر ہی دیا تھا۔

پُل نزدیک آ رہا تھا اور کشتی کے ہچکولوں میں تیزی آ رہی تھی۔ بجری کے وزن سے کشتی بہت بھاری ہو گئی تھی۔ اور کشتی کو چالو رکھنے کے لئے رزّاق کو بہت زور لگانا پڑ رہا تھا۔ بازوؤں اور گردن کی رگیں بُری طرح اُبھر آئی تھیں۔ اپنا پورا زور لگاتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ پُل کے پار اُسے کشتی ضرور روکنی چاہیئے۔ زونی بے چاری لگاتار چار گھنٹے چپّو تھامے کھڑی رہی ہے اور کل بھی دِن بھر کھڑی رہی۔

کل بھی دِن بھر زونی چپّو تھامے کھڑی رہی تھی۔ دِن کو زیادہ تکلیف نہ ہوئی تھی۔ پر رات کو ... اوہ اگر رزّاق کو گُمان بھی ہوتا تو وہ کسی حالت میں اپنا سفر جاری نہ رکھتا۔ دِن بھر کی تھکان سے اَدھ مؤا ہو کر وہ گہری نیند میں غافل ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ زونی کی آہیں نہ سُن سکا ... ... کراہنا نہ سُن سکا — زونی کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گِرتے رہے۔ درد کی زیادتی سے مجبور ہو کر اُس نے کئی بار سر پٹک دیا تھا۔ کئی بار مُنہ میں کپڑا ٹھونسا تھا۔ بغیر ملّاح کے کشتی کی طرح، جو تُند و تیز طوفان میں گھِری ہو، وہ رات بھر درد کے تھپیڑے کھاتی رہی ... ... ڈوبتی رہی ... ... اُبھرتی رہی۔ پر اُس نے رزّاق کو جگایا نہیں ... ... وہ اُسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود بھی تو نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے ... ... کیا ہو گا ... ؟

اور صبح جاگتے ہی جب رزّاق کی نظر زونی کے چہرے پر پڑی تو وہ بھونچکا سا رہ گیا تھا۔ ایک رات کے وقفے میں ہی زونی کتنی بدل گئی تھی۔ چہرہ سُوکھ کر کانٹا

ہوگیا تھا۔ آنکھوں کے گِرد کالے حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں۔ زونی کو اس حالت میں پا کر وُہ شرمندہ سا ہو گیا تھا اور ہکلاتے ہوئے وہ پُوچھ بیٹھا تھا ——"تم کتنی سپید نظر آ رہی ہو——" یہ زونی نے مُسکراتے ہوئے کہا تھا ——"نہیں تو... ... وہم ہے تمہارا... " اور وُہ اُٹھ کر چائے بنانے لگی تھی ——

زونی کی مُسکراہٹ اُسے فریب نہ دے سکی۔ مُسکراہٹ میں کچھ مُردنی تھی... ... کچھ روکھا پن تھا... ... وہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ مُردنی کیا ہے... ... روکھا پن کیا ہے ... ... پر کچھ ضرور تھا۔ اُس باس کی طرح جو حد سے زیادہ پکے ہوئے پھل میں پیدا ہوتی ہے یا اُس بُو کی طرح جو بہت دیر تک پانی میں ڈوبی کشتی میں پیدا ہوتی ہے۔

زونی اور وُہ —— دونوں کے لئے یہ تجربہ نیا تھا... ... پہلا... ... اس لئے وُہ دونوں حیران تھے... ... پریشان تھے... ... وہ جانتے نہ تھے کہ آنے والے واقعات کا کِس طرح سے سامنا کریں... ... ایک دم ہی تو سب کچھ ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ حالات ایسا پلٹا کھائیں گے۔ اُنہیں پیٹ کے دھندوں سے فرصت ہی کب مِلی تھی یہ چیزیں سوچنے کے لئے... ... سمجھنے کے لئے... اور اب... کچھ خوف تھا... ... کچھ خوشی تھی... ...

رزاق سے اب سہا نہ جاتا تھا۔ اِن چار گھنٹوں میں اُس نے بہت دفعہ زونی کی طرف دیکھنا چاہا... ... بارہا دِلاسہ دینا چاہا... ... تاکہ آنے والی اذیت کو کم کرنے میں مدد دے... ... لیکن کوشش کے باوجود پلکیں نہ اُٹھتی تھیں... ... زبان کہنے سے قاصر تھی... ... کہتے ہی کوئی خوفناک خیال اُس کے حلق میں اٹک سا جاتا تھا... ...

اور زونی ... ...

درد کی لہر جب کبھی اُٹھتی تھی تو وہ بے بس سی ہو جاتی تھی۔ اُسے محسوس ہوتا
... ... جیسے کوئی اُس کے پیٹ کو چیر رہا ہے... ... کُند چھُری سے ہلکے ہلکے..
... ... اُسکی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگتا... ... پُل کے شہتیر رینگتے نظر آنے..
... ... اور اُبلتا مٹیالا پانی تیزی سے بدن کو جھُلسانے لگتا... ... عجیب درد تھا
یہ... ... زخم دکھیا نہ جاتا تھا۔ پھر بھی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پر تلخی کے باوجود اُسے
کچھ رُوحانی خوشی سی محسوس ہو رہی تھی۔ چھاتیوں میں کسک سی پیدا ہو رہی تھی۔ بہت
دن پہلے سے اُس نے یہ کسک محسوس کی تھی اور اُس نے بہت دفعہ چھاتیوں کو ٹٹولا
بھی تھا... ... کچھ بھی تو نہیں تھا، صرف پیٹ کے ساتھ ساتھ وہ بھی اُبھر رہی تھیں۔
پیٹ پر تناؤ آ گیا تھا... ... کتنا بھدا لگ رہا تھا پیٹ... ... !

چار گھنٹے برداشت کرتے کرتے رزّاق بوکھلا سا گیا۔ اور اب ڈانڈ کے سہارے جُھکا۔ وہ خدا کو کوسنے لگا۔ وہ حیران تھا کہ خدا نے صرف عورت ہی کو درد سہنے کے لئے کیوں پیدا کیا ہے... ... جب قصور دونوں کا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ صرف ذہن میں اُلجھے خیالات کا ایک ہنگامہ تھا۔ جسے سلجھانے میں وہ ناکام ہو رہا تھا۔ یکایک وہ ٹھٹھک گیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ زونی بہت درد محسوس کر رہی ہے۔ اُسے یقین نہ تھا۔ یہ خیال شاید یوُں ہی آ گیا۔ پر زونی کے چہرے پر درد کا کچھ اثر ضرور تھا۔ زونی کے ہونٹوں کا کھچاؤ... ... چپّو پر اُنگلیوں کی گرفت... ... کتنی سختی سے چپکی تھی اُنگلیاں چپّو سے... ... جیسے لکڑی میں گھُس جانا چاہتی ہیں۔ رزّاق سے رہا نہ گیا۔ وہ پوُچھ بیٹھا — "زونی ٹھیک تو ہو... ؟" زونی صرف سر ہلا سکی۔

پانی کا شور گرج میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جھاگ سطح پر چکر کھاتے کھاتے کشتی کے

کناروں کا سہارا لینے لگی تھی۔ اور کشتی ہولے ہولے پانی کو چیرتے ہوئے گراہ رہی تھی۔
وہ زونی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ زونی کو سہارا دینا چاہتا تھا... پر کیسے
... وہ ڈانڈ تو چھوڑ نہیں سکتا تھا کشتی ڈانڈ کے سہارے ہی تو بہاؤ کے
آگے کھڑی تھی۔ اور بہاؤ پورے زور سے موڑ کے اونچے کنارے سے ٹکرا رہا تھا—
کنارے کی مٹی گھل گھل کر مٹیالے پانی کے رنگ میں گہرائی کی لکیریں پیدا کر رہی تھی۔ موڑ
سے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں چمگادڑوں کی طرح چمٹی پڑی تھیں۔
معاً اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ کشتی کو بہاؤ پر چھوڑ کے کہیں نیچے روک لے...
پر کہاں... بہت دور تک تو دریا کے کنارے عمداً کھڑے تھے۔ پانی کی سطح
سے کچھ دو فٹ اوپر تک مٹی بہاؤ کے زور سے کھرچ کھرچ کے بہہ گئی تھی اور اوپر
والی سطح پانی پر مونڈوں کی صورت میں باہر اُبھر آئی تھی۔ اوپر والی سطح کے سایے
خوفناک طریقے پر دریا پر تھرتھرا رہے تھے۔ مونڈوں سے درختوں کی جڑیں پھانسی کی
رسیوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اگر دور تک کشتی کو بہنے دے تو بعد میں کشتی پر
قابو پانا آسان نہ تھا۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اتنی بھاری کشتی ایک دفعہ بے قابو
ہو جائے تو گولی کی طرح کنارے سے ٹکرا جائے گی اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی — یہ
زونی کو مدد کی ضرورت تھی... سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ پیلی پڑتی جا رہی
تھی۔ چہرہ خوفناک لکیروں میں ڈھلتا جا رہا تھا۔ آنکھیں بری طرح پھیلتی جا رہی تھیں...
... رزاق اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے ساری دُنیا اُس کی بربادی کی
منتظر بیٹھی ہے... یہ اونچے کنارے، جن کی طرف دیکھ کر ذہن میں خواہ
مخواہ ڈراؤنے خیالات رینگنے لگتے ہیں،... یہ مٹیالا پانی... جیسے کوئی

لمبی لاش بہی جارہی ہے ... ... یہ بجری سے بھری کشتی اور کندھے سے رگاڈانڈ بھی جس نے اُس کے ہاتھوں میں چھالے ڈال دئے تھے۔ وہ اور کچھ نہ سمجھ سکا۔ اُس کے بدن میں سوئیاں سی چھبنے لگیں۔ اور سمٹی سمٹائی قمیض کی موٹائی کے باوجود اُسے کندھے پر ڈانڈ کی چبھن بُری طرح محسوس ہوئی۔

درد کے جھٹکے زونی کو کبھی دُہرا کر رہے تھے اور کبھی ڈانڈ کی طرح سیدھا... ... وہ کانپ رہی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ پر پُل ابھی دُور تھا۔ چند ہی گز... ... لیکن پھر بھی کتنا دُور... ... درد کی شدت کے باوجود اُس نے چپّو کو اور زور سے تھاما... ... پر کب تک... ... ؟ ابھی اُس کے حواس باختہ نہیں ہوئے تھے۔ ابھی اُس کی اُنگلیوں کی سکت ختم نہیں ہوئی تھی۔

"وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا ... ... کمینہ ... ... بے درد ... ... میں مر رہی ہوں ... ... اوہ ... ..." اُسکی زبان تالو سے لگنے لگی۔ ہونٹ مُرجھا اُٹھے۔ حلق تیزی سے سوکھ رہا تھا... ... پر تر کیسے کرے؟ ... ... چپّو پر جھکے جھکے اُس نے آنکھیں زبردستی کھول لیں... ... سامنے مٹیالا پانی ... ... ناچتا پانی کتنی تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ صرف کچھ فٹ کے فاصلے پر ... ... ہنستا کھیلتا پانی بہا جا رہا تھا... ... ہاتھ ذرا سا بڑھانا تھا۔ ذرا سا جھکنا تھا... ... اور سوکھا حلق... ... وہ کیسے جھکے؟ کیونکر ہاتھ بڑھائے؟ ... ... وہ جانتی تھی کہ ایک دفعہ جھک کر وہ پھر نہ اُٹھ سکے گی۔ اور چپّو تھامے رکھنا تھا... ... چپّو تھامے رکھنا تھا — "اوہ ... ... وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا... ... وہ کشتی کیوں نہیں بڑھاتا... ... ؟ وہ کشتی کیوں نہیں بڑ... ... ..." زونی کراہنے لگی۔

زونی کو چبوترے پر ڈھیرا ہوتے دیکھ کر رزاق کے پاؤں تلے بجری پھسلنے لگی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ زونی یکایک اتنی سخت اذیت میں مبتلا ہو گئی۔ خوف کے زیرِ اثر اُس نے زونی کو جگانا چاہا۔۔۔ ۔۔۔ جھنجھوڑنا چاہا۔ پر آواز حلق میں ہی گھٹ کے رہ جاتی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ کوئی ہتھوڑوں سے اُس کا بھیجا کوٹ رہا ہے۔ بدن میں گانٹھیں پڑ رہی ہیں۔ تلوؤں میں بجری کے چھوٹے چھوٹے دانے نہیں بلکہ نشتر چبھ رہے ہیں۔ اُس کا ذہن سن سا ہو گیا۔ بے وقوفوں کی طرح اُسے خیال آیا۔ "زونی کہتی ہے لڑکا ہوگا۔۔۔ ۔۔۔ میں کہتا ہوں لڑکی۔۔۔ ۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ لڑکی ہوگی۔۔۔ ۔۔۔ خوبصورت سی پیاری لڑکی۔۔۔ ۔۔۔ جس کے بال زونی جیسے۔۔۔ ۔۔۔ لاحول ولا قوۃ ۔۔۔ ۔۔۔ آگ لگ جائے بالوں کو۔۔۔ ۔۔۔"

وہ دفعتاً اپنی سراسیمگی پر پریشان ہو گیا اور غصے میں آکر بڑبڑانے لگا۔۔۔ "میں باؤلا تو نہیں۔۔۔ ۔۔۔ زونی میری خاطر۔۔۔ ۔۔۔ کشتی کی خاطر اتنی تکلیف سہہ رہی ہے اور میں ہار کر۔۔۔ ۔۔۔" اُس نے زونی کا بھر سے جائزہ لیا۔ وہ برداشت نہ کر سکا۔ ذہنی اور جسمانی کشمکش میں اُس کا بدن ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ نجات پانا چاہتا تھا صرف ایک سے۔۔۔ ۔۔۔ چند لمحوں کے واسطے۔۔۔ ۔۔۔ مگر کیسے؟۔۔۔ ۔۔۔ اُس نے سہنا تھا۔ زونی کے ساتھ تکلیف برداشت کرنا ہی تھی۔ پر اُسے جلدی کرنا چاہیئے۔۔۔ ۔۔۔ زونی شاید اور سہہ نہ سکے۔۔۔ ۔۔۔ اوہ پُل تو ابھی دور ہے۔۔۔ ایک تیز چوٹ کی طرح پُل اور کشتی کا فاصلہ اُس پر واضح ہو گیا۔ اور اُس کے چہرے پر پھوٹتے پسینے میں آنسوؤں کی نمی بھی جذب ہونے لگی۔

رزاق اپنے کندھے کا درد بھول گیا۔ اب وہ لکڑی کی طرح سخت۔۔۔ ۔۔۔

کھُردرا۔۔۔ ۔۔۔ ڈانڈ کا ایک حصّہ بن گیا۔ اور کوئی نامعلوم طاقت اُس پر بے انتہا زور صرف کرنے لگی۔ کشتی کی حرکت میں نئی تیزی آگئی۔ پانی اور کشتی کے ٹکراؤ کی گرج اور اُونچی ہو گئی۔

کِتنی پھُرتی آگئی اُس کے تھکے جسم میں۔۔۔ ۔۔۔ جیسے پانی کے بہاؤ کا سارا زور اُس میں سما گیا ہو۔ اور ڈانڈ کِتنی تیزی سے پانی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ جیسے یہ ڈوبتا ہی جائے گا۔۔۔ ۔۔۔ جیسے اِس دریا کی تہہ ہی نہیں۔۔۔ ۔۔۔ پر نہیں۔۔۔ ۔۔۔ آخر ڈانڈ تہہ سے ٹکرا ہی گیا۔ اور کشتی جھٹکے سے پانی کا مقابلہ کرنے لگی۔ اُس نے زونی کی طرف دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لئے۔۔۔ ۔۔۔ ایک لمحہ بھی کِتنا لمبا محسوس ہوتا ہے۔ اُس نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔ اُسے معلوم تھا وہ بُزدِل بنتا جا رہا ہے۔۔۔ ۔۔۔ پر اس وقت وہ جان بُوجھ کر بُزدِل بننا چاہتا تھا۔ اُفوہ۔۔۔ ۔۔۔ کِس قدر خوفناک ۔۔۔ کِس قدر ڈراؤنا تھا یہ ایک لمحہ۔۔۔ ۔۔۔! موت کی ساری طاقتیں لئے یہ ایک لمحہ اُس کے بدن کو چیرتا جا رہا تھا۔ وہ عمر بھر اِس لمحے کو نہ بھُول سکے گا۔ راتوں کو کشتی کے کھُردرے تختوں پر وہ ڈراؤنے خواب دیکھا کرے گا۔۔۔ ۔۔۔ زونی درد کے مارے دُہری ہوئی جا رہی ہے۔۔۔ ۔۔۔ چپُّو پھِسلتے پھِسلتے وہ ناؤ کے کنارے سے آ لگی۔ چپُّو اُنگلیوں سے پھِسل رہا ہے اور کشتی پتوار بغیر ٹیڑھی ہو رہی ہے۔ پانی کی تیزی میں کشتی تِنکے کی طرح چکّر کھاتی ہوئی سامنے موڑ کے کالے اُونچے کِنارے کی طرف بڑھی جا رہی ہے۔۔۔ ۔۔۔ تیزی سے بڑھی جا رہی ہے۔۔۔ ۔۔۔ اِتنی تیزی سے۔۔۔ ۔۔۔ اتنی تیزی سے۔۔۔ ۔۔۔

اُس کے سر میں چکر سا آ گیا۔ بدن اکڑا ہوا۔۔۔ ۔۔۔ پٹھّے تنے ہوئے۔۔۔ ۔۔

سر اٹھا ہوا .... آنکھیں بند، وہ آنے والے جھٹکے کا انتظار کرنے لگا۔ کندھے پر بدستور
دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بے انتہا دباؤ .... جیسے کوئی کیل ٹھوک رہا ہو ....
پر کشتی بڑھتی جا رہی تھی .... لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

کشتی پُل کے نزدیک پہنچ گئی تھی۔ پُل اور کشتی کا درمیانی فاصلہ یقیناً کم ہوتا جا رہا
تھا۔ اب پُل کا سایہ ہلکی کشتی کو چھونے لگا .... کشتی پر بڑھنے لگا۔ بہتے پانی کا
شور دھاڑ میں منتقل ہو رہا تھا اور رزاق اپنے جوان جسم کا سارا زور .... سارا نچوڑ
ڈانڈ پر صرف کرنے لگا۔ کشتی تیز ہچکولے کھاتی ہوئی پُل کے نیچے آ گئی اور سامنے کچھ گز
کے فاصلے پر ایک اور ٹھہری کشتی کا سرا .... وہ مدد کے لئے کیوں نہیں پکار رہا ہے۔
.... کیوں نہیں چلا رہا ہے؟ پر کیا فائدہ .... ؟ دوسری کشتی میں تو کوئی نہیں
تھا۔ صرف لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر .... کاٹھ کے پُتلے جو ہل تو نہیں سکتے تھے۔
پر دیکھ سکتے تھے۔ اُسکی بربادی کے منتظر تھے۔ خاموش اژدہوں کی طرح غائبانہ اُس کی
بے کسی کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ کاش وہ میرا ہاتھ آئے! صرف ایک دفعہ اُس کی
انگلیاں اس دوسری کشتی کے سرے میں کھُب جائیں .... اُس کا گلا بُری طرح سے
خشک ہو گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گلے میں دراڑیں پڑ گئی ہیں اور اُن میں سے
خون بہہ رہا ہے۔ نمکین خون .... اُس نے بائیں ہاتھ سے مُنہ پونچھا .... ہونٹ
دانتوں تلے آ کر کٹ گیا تھا اور تھوڑا سا لال نمکین خون ٹھُڈی پر بہہ آیا تھا۔

زونی کشتی کے کنارے بے بس دُھری پڑی تھی۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی کہ کیا ہو
رہا ہے .... کیوں ہو رہا ہے؟ صرف پیٹ کے نچلے حصّے میں آگ سی دہک رہی تھی۔
جو اُسے بُری طرح جلائے جا رہی تھی۔ وہ چپّو سے سہارا لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس

کے دِماغ میں یہ خیال بُری طرح سے سرایت کر گیا کہ یہ چپّو ہی اُسے اِس اذیّت سے نجات دِلا سکتا ہے۔ اُس کی اُنگلیاں چپّو میں گھُس جانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن یہ آگ ... ... یہ تپش کیوں کم نہیں ہوتی؟ اوہ ... ... یہ لال لال شعلے ... ... خوف ناک دہکتے انگارے ... ... اُس کے چاروں طرف پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ چیخنے لگی۔ ٹانگیں بے دردی سے پٹکنے لگی ... ... کالا دُھواں اُس کا دَم گھونٹ رہا تھا ... ... سینہ چیر رہے تھے یہ کڑوے گھونٹ اور دُھواں بڑھتا جا رہا تھا ... ... پھیلتا جا رہا تھا۔

رزّاق سے اب کچھ نہ سوچا جاتا تھا۔ اُس کا سارا زور ... ... ساری تڑپ ڈانڈ پر صرف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ صرف دیکھ رہا تھا۔ سمجھے بغیر دیکھ رہا تھا۔

زوُنی بے حِس کشتی کے کنارے دُوہری پڑی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر بجری میں جذب ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی ہلکی گلابی لہریں چہرے پر پرچھائیاں سی ڈال جاتیں اور پھر وہی سپیدی ... ... ہونٹوں کے کنارے پھڑک رہے تھے۔ شاید کراہ رہی ہے۔ پر پانی کی گرج آواز کو سُنائی دینے سے پہلے ہی دم گھونٹ دیتی تھی۔ رزّاق کا سر دوسری کشتی کی طرف مُڑا۔ بس پاس ہی تو تھی کشتی ... ... اُس کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا ... ... کاش زوُنی چپّو تھامے رہے ... ... اُس کے تھکے ذہن میں یہ آواز بار بار ٹکرا اُٹھی ۔ "کاش زوُنی چپّو تھامے رہے!"

پانی کی گرج کانوں میں گونج پیدا کر رہی تھی اور وہ جھنجھلا اُٹھا۔ دِل کی دھک دھک ہی کیا کم پریشان کر رہی تھی۔ اُس نے کانوں کو بند کرنا چاہا۔ پر ہاتھ ڈانڈ سے چمٹے پڑے تھے اور ڈانڈ تیز بہاؤ میں کانپ رہا تھا۔ اُس نے چلّانا چاہا تاکہ پانی کی گونج کو اپنی

آوازیں گم کر سکے۔ پانی کا شور اُس کا مُنہ چِڑا رہا تھا۔ اُس کی بربادی پر قہقہے مار رہا تھا۔

" زونی چچو نہ چھوڑنا ... ... زونی۔ " وہ پوری شدّت سے چلّایا۔ جیسے پانی کی تیزی کو للکارا۔ پر آواز حلق سے باہر نہ نکلنے پائی۔ کچھ ہو گیا تھا اُسے ... ... اور وہ محسوس بھی کر رہا تھا۔ وہ چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ نگاہوں کو زخمی کرنے والی نوکیلی چٹانوں سے بھرپور پہاڑ ... ...سِسکتی آہوں کی طرح گرد کے مرغولوں سے ڈھکی ہوئی سُنسان سڑک ... ... اُس کی بربادی کی پرچھائیاں اوڑھے ہوئے یہ خاموش کھیت ... ... خوفناک درندوں کی طرح تاک لگائے ہوئے یہ اُونچے کنارے ... ... کچھ بھی تو نہیں تھا ... ... صرف مٹیالے رنگ کا رواں سیال مادہ .. ... مٹیالہ گہرا پانی ... ... موت کی طرح گہرا اور زرد ... ...اُس کی آنکھیں بھی مٹیالی ہوئی جا رہی تھیں اور پیر بجری پر پھسلتے جا رہے تھے۔

کوئی چیز گہرے پانی میں چمکی ... ... چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی چمکتی سطح ... ... زندگی کی جھلکیاں ... ... اُس نے زونی کی طرف دیکھا۔

زونی مجسّم زندگی تھی۔ اُس کا سارا بدن پانی سے باہر پھینکی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ ٹانگیں کشتی کے کناروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ سر بجری پر زور زور سے ہل رہا تھا۔ چیخیں دریا کی گونج کو دباتے ہوئے فضا میں منڈلا رہی تھیں۔ رزّاق کو محسوس ہوا کہ یہ چیخیں نہیں منڈلا رہی ہیں، گِدھ منڈلا رہے ہیں۔ چچو زونی کی کانپتی اُنگلیوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے پھسلا جا رہا ہے۔

گھبرا کر اُس نے مُڑ کر دوسری کشتی کی طرف دیکھا۔ دوسری کشتی کا سرا بالکل،

نزدیک آگیا تھا۔ کسی نامعلوم قوت کے زیر اثر وہ لپکا۔ اُسکی تھکی اُنگلیاں دوسری کشتی کے سِرے سے ٹکرا گئیں اور پھسلنے لگیں۔ اُنگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی تھی۔ دوسری کشتی کے سِرے پر ناخن لکڑی چھیلتے جارہے تھے اور اُس کا بدن کھچتا جارہا تھا۔ اُسے بے انتہا ٹھنڈا محسوس ہوئی ... نوکیلی جو دل میں تیز چاقو کی طرح اُترتی جارہی تھی۔ بدن پر کیڑے رینگتے محسوس ہوئے۔ دفعتاً اُس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔ ٹانگوں میں جھٹکا سا محسوس ہوا۔

چشم زدن میں اُس نے دونوں کشتیوں کے سِروں کو باندھ دیا۔

رزاق مُڑا اور مُڑا ہی رہا ... ...

زونی کا بے حس سر کشتی کے ہچکولوں سے بجری پر دھیرے دھیرے ہل رہا تھا۔ بایاں ہاتھ کشتی کے کنارے سے چمٹا پڑا تھا اور داہنے ہاتھ کی مُٹھی میں گول گول بجری بھینچی ہوئی تھی۔ ٹانگیں بُری طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے پر آنسو کے ننھے ننھے قطرے دُھوپ میں تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور چھوٹو دور ... مُردہ کالے سانپ کی طرح بہہ رہا تھا۔ اُسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اُس کا سارا دماغ جیسے ماؤف ہوگیا۔ صرف سر میں درد بڑھتا جارہا تھا اور وہ بے وقوفوں کی طرح کھڑا مُنہ کھولے زونی کو دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً اُس نے پھریری لی۔ زونی شاید اُنگلیاں ہلا رہی تھی۔ سر میں درد شام کے اندھیرے کی طرح گہرا ہوگیا۔ تیزی سے گہرا ہوتے لگا اور وہ اپنے آپ سے بھاگنے کے لئے اندھا دُھند بجری پر بھاگتا ہوا زونی کے پاس پہنچا۔

زونی کے حلق سے عجیب سی آوازیں آرہی تھیں جیسے جھنجھنا بج رہا ہو۔ اور اُس کے تھنوں سے پانی کا شور اُونچا ہوتا سُنائی دیا۔ جیسے اپنی ناکامی پر نالہ و شیون کررہا ہو۔

اور پھرن کے نیچے کچھ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے اُس نے پھرن کا دامن ہٹایا۔

زونی کی سپید رانیں خون میں نہائی ہوئی تھیں۔ لال لال خون . . . جس میں سے دھواں سا اُٹھ رہا تھا۔ کشتی کے تختوں پر بہتے ہوئے بجری کے بڑھتے ڈھیر میں گم ہو رہا تھا۔ اور ٹانگوں کے بیچ ایک ننھی سی جان متحرک تھی۔ رزاق کو کچھ خوشی محسوس نہ ہوئی۔ یہی تو سب تکلیف . . . فکر . . . ڈر . . . کی جڑ تھا۔ پھر بھی وہ اس گوشت کے لوتھڑے کی حرکات دیکھنے میں منہمک ہو گیا۔ ننھی ننھی ٹانگیں ہوا میں سٹپٹا رہی تھیں اور ننھے ننھے بازو زونی کی ٹانگوں کو دھکیلنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

کراہنے کی آواز سن کر اُس نے زونی کی طرف نگاہیں پھیر لیں۔ کتنا سپید تھا زونی کا چہرہ . . . برف سے بھی زیادہ سپید . . . زونی کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں۔ ہونٹ دھیرے دھیرے پھڑپھڑا اُٹھے۔ اُس نے زونی کے منہ کے قریب کان لگائے وہ کہہ رہی تھی ——

"جلدی کرو . . . نال کاٹ کر کپڑے سے باندھ دو . . . جلدی . . . "

اور وہ بے سدھ ہو گئی۔ گھبرا کے اُس نے لرزتے ہاتھوں سے قمیص کو پھاڑ ڈالا۔ نال کو کاٹتے ہوئے بچہ زور سے چیخ پڑا۔ اور وہ ڈر سا گیا۔ اُس نے زونی کی طرف دیکھا۔ زونی کا چہرہ درد کی شدت کا آئینہ دار تھا۔ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے وہ خون میں لتھڑے ہوئے سرے کو قمیص کے ٹکڑے سے کس کر باندھنے لگا :

ڈوراہا

دُوراہا

محمد و پہاڑی کھوہ کے باہر بڑی چٹان کی آڑ لئے بیٹھا گرتے برف کے گالوں میں کھو گیا تھا۔ کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آتا۔ اُس کے بدن میں نوکیلی سوئیاں چبھو دیتا۔ کچھ برف کے ننھے ننھے گالے اُس پر چھادر کر کے بکھرتے برف کے گالوں کو چھیڑ لنے جاتا۔ پر وُہ اس دِل کش منظر سے بے نیاز کھوہ میں بڑھتی ٹاپوں کی آواز سُن سُن کر دِل مسوس کے رہ جاتا تھا۔ شاید اُس کی آنکھوں میں برف کے ننھے ننھے گالے بھی سما کے پانی پانی ہوئے جا رہے تھے یا شاید برفیلی ہوا کے جھونکوں نے اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو اُبھار اتھا۔ لیکن آنکھوں میں پانی بڑھتا جا رہا تھا۔ حتےٰ کہ محمد و کو گرتی برف میں آس پاس کے پیڑ گڈ مڈ ہوتے دکھائی دئے۔ برف کی بڑھتی چادر دُھندلی ہو گئی اور وہ سردی کے باوجود لوئی سے ہاتھ باہر نکال کر آنسو پونچھنے پر مجبور ہوا۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ ہوا بہت ٹھنڈی ہے۔ لوئی اُس کے گِرد کچھ ٹھیک ڈھنگ سے لپٹی نہیں ہے۔ اس لئے اُسے چاہیئے کہ اُٹھ کر کھوہ کی نوکیلی پتھریلی دیواروں میں چھپ جائے۔ یہ برف تو جیسے آج اُس کی قبر بنانے پر تُلی ہو۔ پر وُہ اُٹھ نہ سکا۔ اُٹھتا بھی کیونکر.. ... ؟ کھوہ کے باہر تو وُہ جیسے تیسے سردی برداشت کر رہا تھا۔ گو پاؤں جم سے گئے تھے۔ پر کھوہ کے اندر گھوڑے کی بے لسی برداشت کرنے کی اس میں طاقت

نہ تھی۔ گھوڑا بہت بھوک محسوس کر رہا تھا۔ تبھی تو بے زبان بے چارہ بار بار پاؤں پٹک کے اُسے یاد دِلا رہا ہے۔ لیکن وہ جائے تو کہاں ؟ ان پہاڑوں کی خطرناک بھول بھلیوں میں، اِس برفیلے طوفان میں راستہ کیسے تلاش کرے ؟ برف نے تو سب نشان چھپا دئے ہوں گے ... ان روئی جیسے سفید معصوم گالوں نے... ... جو اَن گِنت لکیروں میں پھسلتے جا رہے تھے۔

برف گرنے کی خاموش سرسراہٹ ڈراؤنی سرگوشی بن کر اُس کے کانوں پر چھانے لگی۔ چھا کر اُس کے تن و بدن میں عجیب سی گھُٹن کا احساس پیدا کرنے لگی۔ محمدو کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ برف کی گرتی لکیریں ... ... کھُردری رسیاں بن بن کر اُس کے چاروں اور جال بُن رہی ہیں۔ خاموشی سے جال بُن رہی ہیں اور اُسے اِن گھومتے ناچتے پھولوں سے بھی زیادہ نازک برفیلے گالوں سے نفرت سی ہو گئی۔

اُسے برف سے نفرت نہ تھی بلکہ جوان ہوتے ہوئے تو اُسے اس برف سے کچھ خاص اُنس سا ہو گیا تھا۔ اپنے گاؤں میں جو انہی پہاڑوں کے بیچ کہیں گم پڑا تھا، وہ اپنی جھونپڑی کی کھڑکی میں بیٹھا اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ان برف کے گالوں میں کھو جاتا تھا۔ پھرن میں چھپی کانگڑی کی مدھم گرمی اُس کے گھٹے بدن میں بیٹھی کسک کی طرح رواں ہو جاتی۔ اور وہ حُقے کی نے مُنہ میں اٹکائے ہوئے ان برف کے گھومتے ناچتے گالوں کے تانے بانے میں کھو جاتا۔ برف کے تانے بانے میں کھو کر ارمانوں کے سفید... شفاف معصوم سپنے بُننے لگتا... ... حتّیٰ کہ زونی کی آہٹ کا بھی گمان نہ ہوتا۔ زونی اپنی مخروطی انگلیوں سے ... ... ان برف کے گالوں سے بھی زیادہ سفید... ... زیادہ نازک انگلیوں سے مکّی کا ستو اُس کے مُنہ میں ٹھونس دیتی۔ تب کہیں وہ برف

کے گاؤں کے تانے بانے کو بھول کر ان مخروطی سفید نازک انگلیوں کے تانے بانے بننے لگتا۔

کاش وہ اپنا گاؤں نہ چھوڑ آتا! لیکن اُسے چھوڑ آنا ہی پڑا۔ زونی کو حاصل کرنے کے لئے وہ لکڑیوں کا بوجھ لادے جنگل کے تین تین پھیرے دن میں لگاتا۔ یہاں تک کہ ایک گھوڑا اتنی سخت محنت کی تاب نہ لاکر لکڑیوں کے بوجھ سمیت کھائی میں گر گیا۔ جہاں کچھ سال پہلے اُس کا باپ دو گھوڑوں اور ایک ٹوٹی جھونپڑی کی میراث چھوڑ کر لڑھک گیا تھا۔ چٹانوں پر باپ کا بکھرا بدن دیکھ کر اُسے زیادہ وحشت نہ محسوس ہوئی تھی کیونکہ اُس کے ننھے ذہن میں باپ کے ٹوٹے پھوٹے بدن کی اہمیت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اُن دنوں وہ کبھی کبھار ہی باپ کے ہمراہ جنگل جاتا۔ باپ لکڑیاں کاٹنے میں مشغول رہتا اور وہ ٹوٹی ہوئی لکڑیاں اکٹھی کرنے کے بجائے جنگلی میوے اور خودرو پھول اکٹھے کرتا رہتا۔ پر واپس گاؤں کی اور آنے پر اُسے بے حد کوفت ہوتی تھی۔ گھوڑوں پر لکڑی کے بوجھ لاد کر اُسے باپ پیدل چلنے پر مجبور کرتا۔ جنگلی میووں کا لالچ اور خودرو پھولوں کی خوبصورتی پیروں میں اُبھرتے چھالوں میں ڈوب جاتی۔ اسی لئے وہ اکثر جنگل جانے سے کترا جاتا تھا۔ انکار کرنے پر اُسے باپ مارتا پیٹتا۔ درد کی شدت میں اُسے ماں بری طرح یاد آتی جو اُس کے جنم پر ہی اللہ کے گھر سدھاری تھی۔ زونی سے اُس نے بیسیوں بار تذکرہ کیا تھا اپنی ماں کا۔ شاید اُس کی ماں بھی ایسی ہی ہوتی جیسی زونی کی ماں ... ... کتنا پیار کرتی تھی اُس سے ... ... بہت دفعہ زونی کے ہاتھ کھانا بھی بھیج دیا کرتی تھی اُس کے لئے۔ جنگل نہ جانے پر اُس کا باپ غصے ہو کر اُسے کبھی کبھی بھوکا بھی رکھتا

لیکن جب سردیوں میں برف کی عمیق چادریں سب کچھ ڈھک دیتی تھیں، جنگل سفید کفن اوڑھے مرجاتا تھا۔ تو اُس کا باپ دِن بھر اُسے کہانیاں سُناتا۔ ... ... اپنی کھُردری آواز میں اُسے میٹھے میٹھے گانے سُناتا... ... گھوڑے کی دُم کے بالوں سے چابُک بُننا سِکھا دیتا... ... اُسے پیار کرتا... ... چمکارتا رہتا... ... یہ تو اُن دِنوں کی باتیں تھیں جب اُس کا باپ زندہ تھا۔

لیکن نیچے کھائی میں پہنچ کر اپنے گھوڑے کو دو بڑے پتھروں کے بیچ دم توڑتے دیکھ کر اُسے بے تحاشا رونا آگیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے اُن کا باپ پھر سے مرگیا ہو۔ گھوڑا اُسے عجیب نظروں سے تاک رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پتھریلی نگاہوں کو نہ سہہ کر اُلٹے پاؤں واپس لوٹ آیا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی پیٹھ سے کاٹھی اور مُنہ سے لگام بھی نہ اتاری تھی۔ جنہیں وہ پھر سے اپنے مصرف میں لاسکتا تھا۔

گھوڑا مرگیا۔ پر اُس کے ارمان نہ مرے۔ اور وہ ملٹری کے ٹھیکیدار کے پاس رسد کی باربرداری کے کام پر مامور ہو ہی گیا۔ وہ شاید پھر بھی گاؤں نہ چھوڑتا۔ گو ایک گھوڑے پر گذر کرنی مُشکل تھی۔ زوُنی سے وہ جُدا نہ ہونا چاہتا تھا۔ پر کچھ دِنوں سے اُس کے ذہن میں عجیب سے خیالات رینگنے شروع ہوئے تھے۔ رحمان دُکان دار کا موقعہ بے موقعہ زوُنی کے باپ کو بغیر دام لئے تمباکو کی پوٹلی یا کھانڈ کا چھٹانک آدھ چھٹانک عنایت کرنا کچھ واجب بھی نہ تھا۔ زوُنی بھی کچھ خاموش سی رہنے لگی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ زوُنی نے اُس سے کبھی کوئی شکایت نہ کی تھی۔ کوئی مانگ نہ کی تھی۔ لیکن زوُنی کی بات چیت میں... ... ہنسی میں وہ بے باکی محسوس نہ ہوتی تھی جو خاص طور سے اُس کے لئے مخصوص تھی۔ اِس لئے وہ سر پر کھڑے جاڑوں کی پرواکئے بغیر گاؤں چھوڑ آیا

تھا۔ ٹھیکیدار سے کمائے گئے کچھ ٹکے اُسے زونی کو اُس کے بوڑھے باپ سے چھین لینے
میں کافی مدد دے سکتے تھے۔ پر یہ سالا ٹھیکیدار ۔۔۔ ۔۔۔ آج پھنسا ہی دیا۔ اِس
طوفان میں ۔۔۔ ۔۔۔ اُس نے لاکھ کہا تھا کہ بادل خطرناک ڈھنگ سے منڈلا رہے ہیں۔
۔۔۔ ۔۔۔ لیکن ٹھیکیدار کو اپنے کام سے کام ۔۔۔ ۔۔۔ اُس کی یا اُس کے بے زبان گھوڑے
کی کیا فکر تھی ۔۔۔ ۔۔۔ مجبور کر ہی دیا پھیرا لے جانے پر ۔۔۔ ۔۔۔ وہ تو اللہ کا شکر تھا
کہ واپس آتے وقت برف گرنی شروع ہو گئی تھی۔ کہیں جاتے وقت شروع ہوتی تو گھوڑا
بوجھ تلے دب کے رہ جاتا ۔۔۔ ۔۔۔ دیا سلائی بھی تو نہیں اُس کے پاس، تا کہ آگ ہی
جلا سکے ۔۔۔ ۔۔۔ رات بھر تو ٹھٹھر کے مر جائیں گے دونوں۔ بھوک تو اب واقعی جان
نکالنے پر تُلی ہوئی تھی۔ گھوڑا الگ بھوک سے بے بس ہو کر پاؤں پٹک رہا تھا ۔۔۔ ۔۔۔
بے چارہ ۔۔۔ ۔۔۔ وہ کوشش تو کر سکتا تھا اس کھوہ سے نکلنے کی۔ پر گھوڑا اس
برف باری میں ایک قدم بھی نہ چل سکتا تھا۔ ڈھلوان تو ویسے ہی خطرناک تھی اور پھر
گرتی برف میں راستہ بھی ڈھونڈنا محال تھا۔

دفعتاً گھوڑا زور سے ہنہنا اُٹھا۔ اور وہ چونک پڑا۔ تب اُسے محسوس ہوا کہ
بہت دیر سے اُس کی نگاہیں دُور کالے ہلتے دھبے پر مرکوز ہیں۔ برف کی تھرتھراتی دیوار
میں کالا سا یہ سا اُبھر رہا تھا۔ یہ شاید اُس کا وہم تھا۔ اُس نے آنکھوں کو مسلا۔
برف میں عموماً نگاہیں فریب دے جاتی تھیں۔ نہیں ۔۔۔ ۔۔۔ کالا سایہ تو واضح ہو رہا
تھا۔ دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ گھبرا اُٹھا۔ کہیں کوئی جنگلی جانور سچ
مچ برف سے پناہ لینے کے لئے ادھر کھوہ کی طرف نہ آ رہا ہو۔ ریچھ تو کثرت سے اس
جنگل میں موجود تھے۔ کوئی جنگلی جانور کھوہ کی طرف آ نکلے تو گھوڑے پر قابو رکھنا ممکن

نہیں تھا۔ شاید ڈر کے مارے کھوہ سے نکل بھاگنے کی کوشش بھی کرے۔ محمدو کے ہاتھ پیروں میں سردی نے اتنی سکت ہی کہاں رکھی تھی کہ وہ گھوڑے کو بھاگنے سے روک سکتا... ... اور اُس کی آنکھوں سے غیر ارادی طور پر غصہ اور خوف کی دو دھاریں پھوٹ پڑیں۔

سایہ نزدیک آرہا تھا اور دھیرے دھیرے جھکے ہوئے آدمی کی صورت اختیار کرتا گیا۔ محسوس ہوتے ہی اُسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ ٹانگوں میں بڑھتی اینٹھن رُک گئی۔ رگوں میں خون کی گردش میں اور تیزی آئی۔ جی چاہا... ... اُٹھ کے ناچے... دوڑے... ... دوڑ کے آنے والے کے گلے لگ جائے۔ آدمی کو دیکھے جیسے صدیاں بیت گئی تھیں۔ لیکن وہ اُٹھ نہ سکا۔ ملٹری کی اَن جانی وردی دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ آنے والے کی پیٹھ پر بندوق لٹکی دیکھ کر اُس کے ہاتھ بے تحاشا لوئی کے اندر ہی اندر چابک کو ٹٹولنے لگے۔ لیکن اُسے چابک نہ ملا۔ ڈر اور فکر نے اُس کے ذہن کو اتنا مفلوج بنا دیا کہ وہ بالکل بھول گیا اُس نے خود کچھ دیر پہلے چابک کو کھوہ کے اندھیرے میں غصے سے پھینک دیا تھا۔

آنے والا اب بہت نزدیک پہنچ گیا تھا۔ محمدو اُس کے جسم میں سردی سے بڑھتی کپکپاہٹ کو بھی محسوس کر پایا۔ شاید آنے والے نے اُسے اب تک نہ دیکھا تھا۔ دیکھا بھی ہو تو پتھر سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہوگا۔ تبھی تو نزدیک آکر وہ محمدو کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اجنبی کی پیٹھ اور شانوں پر برف کی موٹی تہہ جم گئی تھی۔ خاکی وردی پانی پی پی کر کالا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ پیٹھ پر بندھا تھیلا جھکے بدن پر کُبڑے کا گمان سا لگ رہا تھا۔ بہت بھدا لگ رہا تھا۔ گھوڑا یکایک پھر زور سے ہنہنایا۔

اور اجنبی کی تیز نگاہیں محمد و کے اکڑے جسم سے پھسل کر کھوہ کے ملگجے اندھیرے کو چیرنے لگیں۔ محمد و کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ڈھال بن کے گھوڑے کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ ان جانے خوف سے اُس کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ شاید اجنبی نے یہ سب کچھ محسوس کیا۔ آنکھیں تو خطرناک لگتی تھیں۔ تبھی اُس نے کہا۔ "ڈرو نہیں بھئی ... ... اس مصیبت میں ہم دشمن نہیں۔" یہ کہہ کر وہ بغیر ہچکچاہٹ کے کھوہ کے دہانے کی طرف بڑھا۔

اجنبی نے بندوق پونچھ کر کھوہ کی دیوار کے ساتھ کھڑی کی۔ پیٹھ پر سے تھیلا کھول کر پاؤں کے پاس پٹک دیا۔ لمبا فوجی کوٹ اُتار کر دہانے کے پاس جھاڑا۔ جھاڑ کر اُسے کھوہ کے ایک نوکیلے پتھر میں اٹکا کر سوکھنے کے لئے لٹکا دیا۔ محمد و کو باہر ہی بیٹھے دیکھ کر اُس نے پھر کہا۔

"بھئی ڈرو نہیں، ہم تو بھائی بھائی ہیں۔ جاؤ کچھ لکڑیاں تو جمع کرو۔ آگ جلائیں گے ... ... افوہ ... ... انگلیوں میں سکت ہی نہیں۔ اجنبی کھانس پڑا۔ گہری کھانسی کی آواز کھوہ میں گونج پیدا کرنے لگی۔

"بھئی راستہ بھول گیا ہوں ڈیوٹی پر جاتے ہوئے ..." اجنبی نے مزید کہا جیسے معذرت کر رہا ہو۔

اجنبی کی آواز میں نرمی محسوس کر کے بھی محمد و کی تسلّی نہ ہوئی۔ اجنبی آخر دشمن کا آدمی ٹھہرا ... ... لٹیرا ... ... کیا معلوم اُسکی پیٹھ پر گولی ہی مار دے اور گھوڑا لے کے بھاگ جائے۔ پر اجنبی کے حاکمانہ لہجے نے اُسے مزید بیٹھنے نہ دیا۔ طوعاً و کرہاً وہ اُٹھا اور کھوہ کے باہر برف کو کُرید کُرید کر درختوں سے گری ٹہنیاں ڈھونڈنے

لگا۔ سرد ہوا کے جھونکے لوئی کے باوجود گوشت نوچے جا رہے تھے۔ یہاں کہیں برف کا کوئی گالا ننگے بدن پر پڑتا تو چبھ سا جاتا تھا۔ سارا بدن ٹھٹھرنے لگا۔ انگلیاں ٹھنڈ کی وجہ سے ٹیڑھی ہو رہی تھیں۔ جی چاہا نکل بھاگے۔ نہ معلوم کیسے پیش آئے یہ اجنبی! پر گھوڑے کو وہ چھوڑ تو نہیں سکتا تھا۔ یہی تو اُس کا ایک سہارا تھا، جس کے ساتھ اُس کی زندگی کی ڈوریں اٹکی تھیں۔ گھوڑے کی یاد آتے ہی اُسنے برف میں ہاتھ مار مار کر کچھ گھاس بھی اُکھیڑ کے اکٹھی کر لی۔ کھوہ کے داہنے ہاتھ تو بہت گھاس تھی۔

جب وہ واپس کھوہ میں پہنچا تو اجنبی نے خالی تھیلے پر ایک چوکور ٹین، کچھ بسکٹ اور چائے کا ایک پیکٹ پھیلا دیا تھا۔ شاید اور بھی بہت کچھ تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے اُسے ٹھیک سے دکھائی نہ دیا۔ کھانے کا سامان دیکھ کر اُس کی کچھ ڈھارس بندھی۔ لکڑیاں فرش پر گرا کر اُس نے پہلے گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی۔ گھوڑا اجنبی کو دیکھ کر بڑا بے کل ہو رہا تھا۔

اجنبی گولی سے ٹین کے ڈبے کو کھولنے میں مشغول تھا۔ محمدو نے خاموشی سے لکڑیاں آگ لگانے کے انداز میں کھوہ کے بیچوں بیچ چُن کے رکھ دیں اور رُک کر اجنبی کا انتظار کرنے لگا۔ اجنبی نے جیب سے دیاسلائی کا ڈبہ نکال کے اُس کی طرف بڑھا دی۔ ماچس پکڑتے ہوئے اُس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش ہوئی ... ... شاید ٹھنڈ کا اثر تھا۔

باہر اندھیرا بڑھ گیا تھا ... ... برف گرنی کم ہوئی تھی۔ بند بھی ہو جائے تو بھی کیا؟ رات تو جیسے تیسے بسر کرنی ہی تھی۔ گھوڑے کا پیٹ بھی بھر چکا تھا۔ اُس کے

اپنے پیٹ میں چائے اور کچھ بسکٹ تیر رہے تھے۔ گو بھوک بالکل نہ مٹ گئی تھی، پھر بھی پیٹ میں کچھ دیر پہلے جس خلا نے اُسے نڈھال کر دیا تھا وہ کچھ پُر سا محسوس ہوتا تھا۔ چائے نے تو گرم لاوے کی طرح گھوم گھوم کے اُس کے ٹھنڈے جسم میں آگ سی بھر دی تھی۔ کاش حقے کے دو کش پینے کو مِل جاتے! اجنبی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ محمد و پتھریلی دیوار سے پیٹھ لگائے لوئی میں اچھی طرح سے لپٹا تمباکو کی طلب کو آگ کی لپٹوں میں گم کر رہا تھا۔ آگ کی لپٹیں بھڑک بھڑک کر کھوہ کی اندھیری دیواروں پر روشنی کی عجیب بے ڈھنگی پرچھائیاں پھیلا دیتیں۔ اور کبھی کبھی اجنبی کی پرچھائیاں خوفناک طور سے بھڑکا دیتیں۔ ... پر وہ اجنبی کہاں تھا اب ... اُس کا نام تو کریم بخش تھا اور کریم بخش فوجی جوان اُسے اپنی کہانی سُنا رہا تھا۔ محمد و خود اپنی کہانی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کب کا سُنا چکا تھا۔ بالکل اُس جیسی کہانی ہی تو تھی اُس کریم بخش کی ... جو ان پہاڑوں کے اُس طرف رہتا تھا۔ دُکھ درد سے لدی — پھندی ... جھُکی جھُکی سی کہانی۔ فرق تھا تو یہ کہ کریم بخش کی ایک بیوی فاطمہ تھی اور دو ننھی منی بچیاں ... بلقیس اور عذرا ... بے چارہ بے کاری سے مجبور ہو کر ... پیٹ کی خاطر ... بیوی بچوں کو پالنے کے لئے فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ بھوکوں مرنے کے ڈر سے دوسروں کو گولیوں سے مارنے پر مجبور تھا۔ ان خوبصورت خطرناک نامانوس برف کے پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر یادوں کے سہارے دِن گذار رہا تھا۔ نہ معلوم کیا کچھ کہہ رہا تھا یہ پردیسی ... اُسے سُننے کی فرصت ہی کہاں ... ؟ اُس کا اپنا دُکھ درد کم تھا کیا ... نہ معلوم اُس کی

اپنی جھونپڑی کی کیا حالت ہو گی۔ زونی کا کیا حال ہو گا... اُسے بھُول تو نہ گئی... اور یہ پردیسی کہہ رہا ہے... سردی وہ برداشت نہیں کر سکتا... گرم مُلک کا رہنے والا ہے... اُسے واقعی سُننے کی کوئی خواہش نہیں... اور پھر تو اُس کی آنکھیں بھی بند ہو رہی تھیں... نیند تو بُری طرح سے غلبہ پا رہی تھی اُس کے وجود پر... دِن بھر کی تھکن... فِکر... کھوہ میں بڑھتے دھوئیں کی کڑواہٹ... ہوں... اجنبی ناحق بڑبڑائے جا رہا ہے... اب تو پلکیں اُٹھانی بھی مُشکل ہو رہی تھیں اور وہ نیند کی آغوش میں لُڑھک گیا۔

برفیلے ہوا کے جھونکوں نے اُسے دھیرے دھیرے جگا دیا۔ کچھ دیر وہ آنکھیں کھولے کھوہ کے ملگجے اندھیرے میں اپنی نگاہوں سے کھوہ کی دیواروں کو ٹٹولنے لگا۔ نوکیلے ٹیڑھے میڑھے کالے پتھروں نے اُسے کھوہ کی موجودگی کا یقین دِلایا۔ زونی کو زبردستی پھر سے اپنے دِل کے تاریک پردوں میں چھُپا کر وُہ گھوڑے کی اور دیکھنے لگا۔ گھوڑا گردن لمبی کر کے مُنہ مار مار کر فرش پر بچے کھچے گھاس کے تنکے ڈھونڈ رہا تھا۔ سامنے راکھ کے ڈھیر اور کچھ اَدھ جلی لکڑیوں کے دوسری طرف کریم بخش کمبل میں لپٹا گٹھڑی سا لگ رہا تھا۔ سرہانے کھڑی بندوق کی نالی چمک رہی تھی۔ لوئی پھینک کر وُہ اُٹھا۔ اُٹھ کر بھرپُور انگڑائی لی۔ اور کھوہ کے دہانے کی طرف بڑھا۔ جہاں چاندی کا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

مطلع صاف تھا۔ رات کے گھنگھور بادل ٹوٹ پھوٹ کر برف کی موٹی تہہ بن کر زمین پر بکھر چکے تھے۔ چڑھتے سُورج کی کِرنوں میں برف پر نگاہیں نہ ٹھہرتی تھیں۔

جھلمل جھلمل جدھر نظریں اُٹھاؤ، لاکھوں کروڑوں ستارے مُسکرا مُسکرا کر نگاہوں کو چُندھیائے جا رہے تھے۔ درختوں کی نرم و نازک شاخیں اتنا حسین بوجھ اُٹھائے شرم کے مارے دُوہری ہوئی جا رہی تھیں۔ اتنی خوبصورتی...... محمدو بہت خوش ہوا، اور کریم بخش کو زور زور سے آوازیں دینے لگا۔

کریم بخش نہ جاگا۔ اس لئے محمدو جاکر اُسے جھنجھوڑنے لگا۔

"کریم بخش... کریم بخش صاحب...... دیکھو تو باہر کیا ہے...... دیکھو تو..."

کریم بخش صرف بڑبڑا اُٹھا۔ "محمدو بھیا...... مجھے بخار...... بدن ٹوٹا جا رہا ہے...... میرے بچے...... میری فاطمہ...... میں کیا کروں محمدو؟... میں کیا کروں؟" کریم بخش کراہنے لگا۔ محمدو رُک سا گیا۔ ہاتھ بڑھا کے دیکھا۔ واقعی کریم بخش کا ماتھا آگ ہو رہا تھا۔ اور کریم بخش اُسے ایسے پکار رہا تھا جیسے کریم بخش فوجی جوان نہیں... ایک ننھا مُنھا بچہ اپنے باپ کے گھٹنے سے لپٹ کر بلک رہا ہے۔ محمدو کے سینے میں تیر سا چُبھ گیا...... یہ نئی مصیبت تھی...... کہاں کہاں لئے پھرے اس کو اس موسم میں......؟ پر وہ چھوڑ بھی تو نہیں سکتا اس کو یہاں...... سردی اور بخار سے مر جائے گا۔ ٹھیک ہے...... وہ اس کو اپنے گھوڑے پر لاد کے لے جائے...... اپنے ساتھ لے جائے...... اور پھر...... پھر...... سوچتے ہی وہ بوکھلا سا گیا۔ چہرے پر چنگاریوں کی بوچھاڑ سی ہوئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ اور وہ کریم بخش کے تپتے چہرے سے نگاہیں ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔ کیونکر ایسا خیال اس کے ذہن میں آ ٹپکا...... کیونکر؟...... لیکن...

... اگر وہ ... ... واقعی اگر وہ کریم بخش کو ... ... دُشمن کے آدمی کو ساتھ لے جاکر اپنی فوج کے حوالے کر دے تو شاید اُسے انعام ملے ... ... اتنا انعام ملے کہ وُہ زونی کو بیاہ کر لائے ... ... شاید دو چار گھوڑے بھی خرید سکے ... ... تب تو جاڑوں میں ... ... ان پہاڑوں کی خطرناک بھُول بھلیوں میں ... ... پر کریم بخش نے تو اُسے چائے پلائی ... ... اُسے بسکٹ کھلائے ... ... کریم بخش نہ آتا تو شاید وہ سردی کے مارے کھوہ سے باہر بھی نہ نکلتا اور گھوڑا بے چارہ رات بھر گھاس کے بغیر بھوکا رہتا ... ... ایک ہی تو تھا اُس کا گھوڑا ... ... اسکی ٹوٹی پھُوٹی ویران زندگی کا سہارا ... ... لیکن وہ کرے تو کیا کرے ؟ ... ... اس سالے کو بھی آج رات ہی بیمار ہونا تھا۔ ناحق پڑا اُس کے شانوں پر ... ... نہ آتا تو وہ جیسے تیسے رات گذار ہی لیتا ... ...

گالیاں بکتے بکتے ... ... غصّے میں بھڑکتے بھُنتے اُس نے بڑی مُشکل سے کریم بخش کو کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹ کر گھوڑے پر پیٹ کے بل لِٹا ہی دیا۔ بہر حال اس کھوہ سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔ بندوق گھوڑے کی کاٹھی میں پھنساتے ہوئے اُسے کریم بخش کی بے بسی پر رحم سا آگیا۔

ایک تو برف پر پھسلن اور پھر گھوڑے کو سنبھالنا ... ... گھوڑے پر کریم بخش کا اَدھ مُوا جسم ... ... محمدو تو اس ٹھنڈی فضا میں بھی پسینے سے شرابور ہو گیا۔ راستہ اُس نے کب کا ڈھونڈ لیا تھا۔ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی، جس پر پہلے سے پڑی ہوئی گھوڑوں کی ٹاپوں سے پڑے ہوئے کھڈ برف کی موٹی تہہ بھی چھُپانے سے ناکام رہی تھی۔ آگے جاکر یہ پگڈنڈی دو پگڈنڈیوں میں تقسیم ہوتی تھی۔

بائیں ہاتھ اُس کا اپنا ملک تھا اور داہنے ہاتھ دشمن کا... ...کریم بخش کا... ...
کریم بخش کی بیوی بچوں کا... ... پگڈنڈی پر پھسلن بہت تھی۔ پھونک پھونک کر
قدم رکھنا پڑتا تھا۔ ذرا سی لغزش تو نیچے ڈراؤنی کھائی مُنہ کھولے انتظار کر
رہی تھی۔

دورا ہا لرزہ کیک آتا جا رہا تھا اور وہ اب تک کچھ فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ بائیں ہاتھ
مُڑنے پر اُس کی اپنی زونی تھی۔ اپنا گھر تھا... ...گاؤں تھا... ... وہ مُڑ
بھی جائے بائیں ہاتھ تو انعام تھا... ...نام تھا... ...پر کریم بخش کی گرفتاری
...اُس کے بیوی بچوں کی موت... ...ہوں... ...وہ گھبرا کیوں رہا ہے؟...
...بیسوں کریم بخش اُس کی زونی پر قربان... ...زونی تو اُس کی زندگی تھی۔ اُسی
کی خاطر تو وہ ان ویرانوں میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا۔ ٹھیکیدار کی گالیاں برداشت
کرتا تھا... ...کاش وہ قدم بڑھا سکے... ...ایک ہی قدم بڑھا سکے... ...
کریم بخش بُخار کی تیزی کے زیرِ اثر اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا... ...پر کریم بخش سے
بندھی اُس کی بیوی فاطمہ، ننھے مُنھے بچے... ...بلقیس... عذرا... ...یہی
نام تو بتلا دِئے تھے کریم بخش نے... ...زونی کے نام کے ساتھ ذرا بھی مشابہت
ہوتی ان ناموں میں... ...تو شاید ترس بھی آجاتا اُس کو... ...لیکن وہ
اپنے حال پر بھی چھوڑ نہ سکتا تھا کریم بخش کو اس خوفناک جنگل میں... ...بے
بس انسان پر جنگلی جانور... ...بے درد درندے... ...بے بس گوشت
کا لوتھڑا سمجھ کر جھپٹ پڑ... ...اُف... ...خیال آتے ہی اُس کے رونگٹے
کھڑے ہو گئے۔

دُوراہا اتنا نزدیک آگیا تھا کہ دونوں مختلف راستے اب برف میں واضح تھے۔ وہ داہنے ہاتھ قدم بڑھانے کی جُرأت نہ کر سکتا تھا تاکہ کریم بخش کو کہیں چھوڑ جائے۔ ... ... داہنے ہاتھ تو اُس کی اپنی موت تھی۔ بچپن سے اب تک وہ اس راستے کی مخالفت کرتا آیا تھا... ... اور بائیں ہاتھ کریم بخش کی موت ... ... کریم بخش کی خاطر وہ اپنا ایمان تو نہ بیچ سکتا تھا۔ وہ کیا کرے؟ ... ... کدھر جائے ... ... کنواری۔ برف کی سطح پر کوئی نشان بھی نہ تھا۔ محمدو کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قدرت نے ان دونوں راستوں پر برف اس لئے پھیلائی ہے تاکہ اُس کا فیصلہ تاابد قائم رہے۔

کاش کریم بخش ہی بولنے کے لائق ہوتا۔ وہی اُسے اس اُلجھن میں سُلجھا سکتا! ... ... اُس نے مڑ کر کریم بخش کی اور دیکھا اور ٹھوکر کھاتے کھاتے بچا — پر کریم بخش کمبل میں لپٹا پڑا اُس کی اُلجھن سے بے نیاز بڑبڑائے جا رہا تھا — "میرے بچے ... ... میری بیوی ... پیاری عذرا ... "

محمدو کا غصہ کنارے توڑ بیٹھا ... ... ہوں ... ... جیسے اُس کی زوجہ نہیں ... ... اُس کا اپنا گھر نہیں ... ... وہ ضرور کریم بخش کو اپنی فوج کے حوالے کر دے گا۔ اُسے کیا پڑی اُن آدمیوں کی، جنہیں اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ... ... کبھی نہ محسوس کیا تھا۔ غصے کی تیزی میں اُس نے گھوڑے کی لگام کو زور سے کھینچا۔ گھوڑا بدک گیا۔ کریم بخش کی درد بھری کراہ اُبھری اور اُبھر کر محمدو کا سینہ چیرنے لگی۔

دُوراہا سامنے تھا ... ... صرف چند قدم کے فاصلے پر ... ... اُس کے

قدم خود بخود رک گئے۔ گھوڑا بھی رک گیا۔ سہارے کے لئے اس نے گھوڑے کی اور دیکھا۔
ذہن میں ایک طرف زونی کی تصویر ابھری۔ زونی اپنے... خم... قوس... اور نہ جانے کیوں
سے بھرپور صاف دکھائی دی۔ اور دوسری طرف دھندلی دھندلی سی کریم بخش کے بیوی
بچوں کی خیالی تصویریں۔ جنہیں اس کے اپنے ذہن نے اپنے رنگ میں ڈھال دیا تھا۔ تیزی
سے ابھر کر زونی کی تصویر میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور گھوڑا اپنی موٹی موٹی کالی آنکھیں لئے
اس کا منتظر تھا۔ وہ کس سے کہے... کس کو رازدار بنائے... کیسے صحیح راہ کا پتہ
لگائے؟ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ گھوڑے کی پیٹھ پر پڑے کریم بخش کے پاس پہنچ گیا۔ سورج
کی تمازت سے برف پگھل پگھل کر نرم ہو رہی تھی۔ اسے جلدی کرنی چاہیئے۔ نہیں تو کچھ دیر بعد
برف اور کیچڑ میں چلنا محال تھا۔ کریم بخش بخار کی تیزی میں بدستور بڑبڑائے جا رہا تھا۔ "میں
آیا عذرا... دیکھو تو بلقیس میں خود آ رہا ہوں... امی کہاں ہے؟... تمہاری امی..."
محمدو کے جی میں آیا۔ دو چابک مار کر اس سالے کریم بخش کا منہ بند کر دے۔ اپنی اس
بے ڈھنگی بکواس سے کریم بخش اس پہ تازیانے برسا رہا تھا۔ اس کا چابک فضا میں خطرناک
انداز سے لہرا اٹھا۔ آنکھوں میں جذبات آنسو بن بن کر چھوٹنے لگے۔ دل کی دھڑکن بڑی
طرح تیز ہوئی۔ بدن میں عجیب سی دہشت امڈ آئی۔ ہاتھ میں بجلی تڑپی اور چابک تڑاخ سے
گھوڑے کی پیٹھ پر برسا۔ جیسے چابک کی تیزی سے وہ سارے بندھن توڑنا چاہتا ہو۔ گھوڑا
بدک گیا۔ بائیں ہاتھ پہ محمدو راستہ روکے کھڑا تھا۔ گھوڑا دا ہنی پگڈنڈی پہ دوڑنے
لگا ـــــ محمدو نے بے خیالی میں چابک پھینک دی۔ وہ بجھی بجھی آنکھوں سے گھوڑے کو
پگڈنڈی پہ دوڑتے دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا کریم بخش دھیرے دھیرے چھوٹا ہوتا
جا رہا تھا۔ اور اس کا ذہن غیر ارادی طور پر اندازہ لگا رہا تھا۔ گھوڑا گھنٹے دو گھنٹے میں

کریم بخش کو کسی نہ کسی آبادی میں پہنچا ہی دے گا۔۔۔ ۔۔۔ضرور پہنچا دے گا۔"

گھوڑا دور ہوتا جا رہا تھا۔ کریم بخش کا جھکا ٹیڑھا بدن گھوڑے کی پیٹھ میں کب کا مدغم ہو چکا تھا۔ اور گھوڑا اتنی دور ننھا کھلونا سا لگ رہا تھا۔ دفعتاً گھوڑا پہاڑ کی اوٹ میں بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی میں گم ہو گیا۔ محمد کا سپنا دھچکے سے ٹوٹ گیا۔ آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے وہ ذہن میں گھوڑے کے کھو جانے کی فرضی کہانی گھڑتے گھڑتے اپنے راستے پر ہو لیا۔
